بسم اللہ الرحمن الرحیم

السیرۃ النبویۃ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام
تحقیقی وتوقیتی مطالعہ: مکی دور

سترہویں قسط

پروفیسر ظفر احمد

Abstract

Al-Sīrah Al-Nabawiyyah: Analytical & Chronological Study

It is the 17th part of a long chain of articles. The existing on is in continuation of the writers' scholarly method of Tahqiq-i-Jaded(the point wise analysis of the relevent debatable issues to arrive at the direct one) under the Quranic guidance. In this treatise he has irrefutably established the solid fact that ALLAH, the Almighty is alone the Omni-Scient i.e the All-knower of the unseen & the seen. He has accordingly eradicated & falsified the poly theistic heretic & antagonistic doctrines & views. His non aggressive & discriminately logical & analytical approach based on sound & healthy contention is immensely informative ainaring at the distinguishing between the right & the wrong.

علم غیب کلی اور اس کے متعلقات تشقیق جدلی کے آئینے میں

پہلا حصہ

رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور اس ضمن میں عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق کے متعلق آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وتطہیر کو صحیح معنوں میں سمجھنے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ہم فکری واعتقادی لغزشوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ آپ ﷺ نے ان لغزشوں کی اصلاح قرآن کریم

کے ذریعہ فرمائی ہے اور دنیا میں اس وقت واحد یہی کتاب ہے جو حق و باطل میں تمیز کی اعجازی شان کی حامل ہے۔ سورہ نحل میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) ہم نے تجھ پر اپنی یہ کتاب اسی لئے نازل کی ہے کہ تو ان باتوں کی پوری وضاحت کردے جن میں لوگوں نے اختلاف پیدا کر رکھا ہے اور (ہماری کتاب تو) سراپا ہدایت اور رحمت ہے''۔ (۱/الف) شرک اور گم راہی کا ایک بہت بڑا سبب مخلوق کے لئے غیب کلی کا علم ثابت کرنا ہے۔ جو چیز ہم محض حواس اور عقل سے معلوم نہ کرسکیں اور جس کے لئے ہمیں سچی خبر و روایت کی بھی ضرورت ہو، وہ ہمارے لئے غیب، چوں کہ سچی خبر کا یقینی اور قطعی ذریعے جس میں کبھی بھی خطا کا احتمال نہ ہو وہ صرف خبرِ رسول یعنی وحیِ ربانی ہے، اس لئے غیب پر یقینی اطلاع صرف پیغمبر کو ہوسکتی ہے۔ ولی کے کشف والہام میں، نجومیوں اور دست شناسوں وغیرہ کی باتوں میں خطا کا احتمال ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے غیبی امور پر مطلع فرماتا ہے۔ وہ جس پیغمبر کو جو چاہے جتنا چاہے بتلائے۔ ساری شریعت دراصل غیب ہی ہے۔ مثلاً ہم اپنی عقل سے یہ معلوم نہیں کرسکتے تھے کہ فجر کی نماز میں دو رکعتیں فرض ہیں۔ پیغمبر نے اللہ تعالیٰ سے اطلاع پاکر ہمیں بھی مطلع کردیا۔ جن غیبی امور پر لوگوں کی دنیوی واخروی فلاح موقوف ہے ان کی اطلاع بہ ذریعہ وحی حضرات انبیاء علیہم السلام کو اور پھر ان کے ذریعے حسب ضرورت عام لوگوں کو دی جاتی ہے۔ یہ غیب جزئی پر اطلاع ہے، غیب کلی پر نہیں کہ ہر وقت کی ہر ہر بات لازماً مخلوق کو معلوم ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے اعلان فرمایا: لا اعلم الغیب کہ میں غیب نہیں جانتا تو متعلقہ آیت کے نزول اور اس اعلان سے پہلے بھی آپ ہزاروں غیوب (غیب کی باتوں) پر مطلع تھے جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کے نزول سے پہلے بھی اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں آیات آپ پر نازل ہوچکی تھیں اور آپ پر ہر آیت کا نزول اطلاع علی الغیب ہی تو ہے اور (مثلاً) سورۂ بقرہ میں ہے وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (۱/ب) ''اور وہ لوگ اس (اللہ) کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے مگر یہ کہ جتنا وہ (خود کسی کو دینا) چاہے۔'' یہاں ''بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ'' میں ''مِن'' یقیناً تبعیضی ہے جیسا کہ اس سے پہلے کلمہ ''بِشَيْءٍ'' سے بہ خوبی واضح ہے۔ اور مثلاً سورۂ آل عمران میں ہے ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (۱/ج) ''یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔'' یہاں بھی ''مِن'' تبعیضی ہے کہ کچھ غیب کی خبریں مراد ہیں، سب کی سب غیبی خبریں مراد نہیں ہیں۔ اسی لئے جو حضرات غلط فہمی سے رسول اللہ ﷺ اور انبیاء سابقین علیہم السلام بل کہ اولیائے کرام تک کے لیے غیب کلی کے قائل ہیں، وہ بھی صرف اس زمانے کے لئے اس کا دعویٰ کرتے ہیں جو تخلیق کائنات سے قیامت کے دن کے تمام مراحل طے ہونے تک کا ہے جب کہ

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زمانے میں کسی بھی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی غیب کلی پر مطلع نہیں فرمایا ہے، صرف بعض جزئیات پر ہی مطلع فرمایا ہے۔ خواہ وہ مخلوق کے علم کے اعتبار سے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر دور اور ہر زمانے میں خواہ یہ تخلیق کائنات سے پہلے کا ہو، تخلیق کائنات سے قیامت تک کا ہو یا قیامت سے بعد کے ادوار کا ہو، کائنات کے ذرہ ذرہ پر محیط اللہ تعالیٰ کے ذاتی علمِ مطلق، علمِ محیط تفصیلی وکلی کے مقابلے میں مخلوق کا بعض غیبی جزئیات کا یہ عطائی علم کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غیبی جزئیات کا عطائی علم دراصل علم الغیب ہے ہی نہیں اور نہ ہی جزئیات کا عطائی علم رکھنے والے کو عالم الغیب کہا جاتا ہے کیوں کہ ایک تو مخلوق کا یہ علم محدود ہے، دوسرے ذاتی نہیں بل کہ عطائی ہے۔ علم الغیب سے مراد تو وہ علم محیط اور علم تفصیلی ہے جو کسی کو کسی سبب اور ذریعے کے بغیر از خود حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر ذاتی ہو، عطائی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے۔ مخلوق کا علم ہمیشہ محدود اور عطائی ہوتا ہے۔ ایک ذرے کا بھی ذاتی علم اس کے لئے بالاتفاق محال ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی جلی وخفی، کشف والہام یا کسی بھی اور ذریعے سے جو علم مخلوق کو دیا جاتا ہے وہ اطلاع علی الغیب، اظہار علی الغیب، انباء الغیب ہے، علم الغیب نہیں۔ اگر یہاں اطلاع علی الغیب اور اظہار علی الغیب کو اعلام الغیب یا تعلیم الغیب کے معنی میں لیا جائے، تو اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ مخلوق کو بعض غیبی جزئیات کا علم دیا گیا ہے۔ یعنی یہ عطائی علم غیب جزئی کا علم ہے، غیب کلی کا ہرگز نہیں ہے۔ ہم آئندہ مباحث میں ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کریں گے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے متعلق غیب کلی کے علم کے مفروضہ (غلط) عقیدے سے ان کی تعظیم وتکریم نہیں بل کہ (شعوری یا غیر شعوری طور پر) سخت توہین وتنقیص ہوتی ہے۔ ہمارا مقصد ان مباحث سے کسی کو نیچا دکھانا یا کسی کی تنقیص ہرگز نہیں ہے۔ لیکن فکری لغزشوں پر سکوت اختیار کرنے سے ایک تو قرآن کریم کی اعجازی شان اور اس کا حق ہونا واضح نہیں ہو پائے گا، دوسرے اتحاد بین المسلمین کی مخلصانہ خواہش اور کوشش بھی صحیح معنوں میں ثمر آور نہ ہوگی، کیوں کہ یہ فکری اور اعتقادی اختلاف لازماً ایک دوسرے سے ذہنی دوری بھی پیدا کرتا ہے اور اتحاد بین المسلمین کے بلند بانگ نعرے عقلی سے زیادہ محض جذباتی بنیادوں پر اور وہ بھی ایک عبوری مدت کے لئے استوار ہوتے ہیں۔ ہم کسی کو بھی (معاذ اللہ) اچھوت نہیں سمجھتے۔ سب ہمارے بھائی ہیں۔ پیشہ ورانہ زبانی وقلمی مناظروں، نفرت انگیز مجادلوں سے اجتناب کرتے ہوئے صحیح وغلط میں دانش مندانہ امتیاز کے لئے شستہ اور شائستہ تحقیق کی مثبت اور صحت مند روایت کو ہمیں جماعتی اور گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر پروان چڑھانا چاہئے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ہو کہ ہم اختلاف رائے کو خندہ پیشانی اور

فراخدلی سے برداشت کریں۔ عدم برداشت کے محرکات وعوامل مذہبی ہوں، سیاسی، تمدنی، لسانی ہوں یا علاقائی وطنیت پر مبنی ہوں، کشاں کشاں لوگوں کو جارحیت اور تشدد کی گرم بازاری تک لے آتے ہیں۔ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ۔

۱۔ بہ حوالہ تعیینِ وقت

الف: حضرات انبیاء علیہم السلام کو غیب کلی کا علم عطا کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو یہی حق ہے۔ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو (مثلاً) خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کو غیب کلی کا یہ علم، نزولِ قرآن کی کوئی ۲۳ سالہ مدت سے پہلے ہی دیا گیا تھا یا نہیں۔ اگر پہلے ہی دیا گیا تھا تو حضرت جبرئیلؑ کے توسط سے کوئی ۲۳ سالوں تک آپ پر نزولِ قرآن کی ضرورت ہی کیا تھی کیوں کہ غیب کلی کے (مفروضہ) علم کی بنا پر تو سارا قرآن آپ کو پہلے ہی از برتھا۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) بھول گیا تھا کہ میں اپنے پیغمبر کو پہلے ہی غیب کلی کا علم عطا کر چکا ہوں اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ میرا پیغمبر حاضر و ناظر ہے، لوح محفوظ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اور سارا قرآن اسے پہلے ہی سے معلوم ہے تو ایسے (خبیث) مفروضے کو صحیح قرار دینے سے اللہ تعالیٰ کی طرف نسیان کی نسبت ہوگی۔ عقل سلیم کے بدیہی فیصلے کے مطابق نسیان خالق کے لئے عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ عقل سلیم کے اس صحیح فیصلے کی بھرپور تائید و توثیق قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا تھا کہ میرا رب نہ تو بھٹکتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔ (۲/الف) اور سورۂ مریم میں ہے کہ تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ (۲/ب) اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ اپنے پیغمبر کو عالم جمیع ما کان و ما یکون (جو کچھ ہو چکا اور جو آئندہ ہوگا سب کا جاننے والا) اور حاضر و ناظر بنا چکا ہے، پھر بھی وہ فرشتے حضرت جبرئیلؑ کے ذریعے آپ پر کوئی ۲۳ برس تک نجماً نجماً (تھوڑا تھوڑا کر کے) قرآن نازل فرماتا رہا اور سنت اللہ (اللہ کا طریقہ) یہی ہے تو لازماً یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ایک عبث کام کیا۔ یہ بھی عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسا عیب منسوب کر کے اسے سنت اللہ قرار دینا ظلم پر ظلم ہے۔ جو بات پہلے ہی سے کسی پیغمبر کو بتائی جا چکی ہو وہی بات اسے بے مقصد دوبارہ بتانا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ مخلوق پر کسی بات کی تکرار تاکید کے لئے یا مخاطب اگر بھول گیا ہو تو اس کی یاددہانی (تذکیر) کے لئے یا مخاطب کے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے ہو سکتی ہے یا کوئی بھی اور وجہ ہو، اگر پیغمبر کو پہلے ہی سے ماضی حال اور مستقبل پر محیط غیب کلی کا علم دیا جا چکا ہو تو وہ پہلے سے ہی تکرارِ کلام کے مقاصد،

اسباب اور وقت سے بھی پوری طرح باخبر ہوگا۔ لہٰذا کسی بھی صورت میں اس پر پہلے سے بتائی گئی بات کا اعادہ اور تکرار بہ ہر حال عبث قرار پائے گا۔

اگر کہا جائے کہ حضرت جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر از خود کوئی ۲۳ سال تک وحی لاتے رہے تو حضرت جبرئیلؑ کو اگر علم نہیں تھا کہ رسول اکرم ﷺ کو بہ حیثیت عالم الغیب سارا قرآن پہلے ہی سے از بر ہے تو دوسروں کو یہ علم کہاں سے حاصل ہوگیا؟ اگر جبرئیلؑ کو علم تھا کہ رسول اکرم ﷺ عالم الغیب ہیں اور قرآن آپ سے مخفی نہیں ہے تو وحی کے فرشتے نے بھی (معاذ اللہ) عبث کام کیا۔ خود رسول اکرم ﷺ بھی حضرت جبرئیلؑ کو (معاذ اللہ) اس عبث کام سے ابتدا ہی سے منع فرما دیتے کہ آپ کی تشریف آوری کی ضرورت نہیں۔ مگر فرشتہ پھر بھی ۲۳ سال تک (معاذ اللہ) خواہ مخواہ وحی اُتارتا رہا۔ پس حضرت جبرئیلؑ کے از خود وحی لانے کا یہ مفروضہ خلافِ عقل تو ہے ہی، خود قرآن کریم سے بھی اس کی بھرپور تردید ہو رہی ہے۔ سورۂ مریم میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) ہم (ملائکہ) تیرے رب کے حکم کے بغیر (زمین پر) اُتر نہیں سکتے۔ ہمارے آگے پیچھے اور ان کے درمیان کل چیزیں اسی کی ملکیت میں ہیں اور تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے''۔ (۲/ج) اب اگر کہا جائے کہ نزول قرآن کی مدت کے درمیان کسی بھی لمحے پر آپ ﷺ کو غیب کلی کا علم دیا گیا تھا تو اس صورت میں بھی باقی ماندہ قرآن کا نزول (معاذ اللہ) عبث اور بلاضرورت ہوگا اور مذکورہ بالا تمام اشکالات اس باقی ماندہ نزول قرآن پر بھی پوری طرح وارد ہوں گے۔ اب اگر تنگ آ کر یہ شق اختیار کی جائے کہ نزول قرآن کی تقریباً ۲۳ سالہ مدت کے دوران آپ کو غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا تھا، پورا قرآن نازل ہو چکا تو آپ کو عالم جمیع ما کان و ما یکون بنایا گیا تھا تو سوال پیدا ہوگا کہ نزول قرآن کی مدت کے دوران آپ ﷺ رسول اور نبی تھے یا نہیں؟ اگر کہا جائے کہ نہیں تھے تو یہ بالاتفاق کلمہ کفر ہے، کیوں کہ پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہی آپ کی رسالت کا ظہور ہوگیا تھا اور قرآن کریم میں جگہ جگہ آپ کو رسول اور نبی کہا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ نزولِ قرآن کی مدت کے دوران بھی آپ ﷺ رسول تھے اور یہ بھی مان لیا گیا کہ اس مدت میں آپ ﷺ کو غیب کلی کا علم حاصل نہ تھا تو ثابت ہوگیا کہ رسالت اور غیب کلی کا علم لازم و ملزوم نہیں، یعنی پیغمبر کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ وہ غیب کلی کا علم رکھتا ہو وہو المطلوب۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جب آپ کو نزول قرآن کی ۲۳ سالہ طویل مدت کے دوران رسول اور نبی ہونے کے باوجود غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا تھا تو لفظ ''نبی'' کا معنی ''بہ ذریعہ وحی غیب کی خبریں دینے والا'' ہے، نہ کہ اس کا مطلب ''غیب کلی جاننے والا'' ہے۔ پس نبی کے لفظ سے غیب کلی کے علم پر استدلال قطعاً باطل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ۲۳ سال تک غیب کلی کا علم عطا نہ ہونے سے رسول

اللہ ﷺ کے منصب رسالت میں قطعاً کوئی خلل پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی اس سے آپ کی توہین وتنقیص ہوئی ہے تو مکمل نزول قرآن کے بعد بھی غیب کلی کا علم نہ دیئے جانے سے ہرگز آپ کی توہین لازم نہیں آتی۔ حجۃ الوداع کے ایام میں مکمل نزول قرآن پر آپ ﷺ) صرف کوئی تین ماہ کے بعد اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ اگر ۲۳ سال تک آپ عالم جمیع ما کان وما یکون نہیں تھے تو اگر نزول قرآن کی مدت کے پورا ہونے کے بعد تین ماہ بھی اسی حالت میں گزرے ہوں تو اس سے بھلا آپ ﷺ کی کیوں توہین لازم آئے گی؟ بل کہ اس کے برعکس حضرات انبیاء علیہم السلام کو عالم الغیب قرار دینے سے ان کی عموماً اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کی خصوصاً سخت توہین لازم آتی ہے جیسا کہ ان شاء اللہ العزیز آئندہ مباحث سے بہ خوبی واضح ہو جائے گا۔ یہاں دل چسپ امر یہ بھی ہے کہ (مفروضہ) علم غیب کلی کے قائلین کے خیال میں رسول اکرم ﷺ) کو تخلیق کائنات سے پہلے کا اور قیامت کے مراحل طے ہونے، جنتیوں کے جنت میں اور جہنمیوں کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد کے زمانے کا علم غیب حاصل نہیں ہے۔ پس جس طرح تخلیق کائنات سے پہلے کے اور قیامت کے مراحل سے بعد کے ادوار کے احوال وکیفیات سے بے خبری سے رسول اکرم ﷺ) کی توہین لازم نہیں آتی، بعینہٖ اسی طرح تخلیق کائنات اور قیامت کے وقوع کے درمیان کے زمانے میں غیر متعلقہ اور لایعنی امور کی لاعلمی اور بے خبری سے بھی بہ شمول رسول اکرم ﷺ) کسی بھی پیغمبر کی ہرگز کسی بھی طرح کی کوئی توہین نہیں ہوتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی نظر لوح محفوظ پر نہیں ہوتی ورنہ ان پر وحی کے نزول کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ وہ لوح محفوظ پڑھ کر نزول وحی کے بغیر ایک ہی وقت میں سب کچھ معلوم کر لیتے، حال آں کہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ) پر اس کا وقتاً فوقتاً نزول کوئی ۲۳ سال تک ہوتا رہا۔ لوح محفوظ کو کتاب مبین یعنی روشن کتاب کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں بہت سی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں۔ مثلاً لوح محفوظ میں ہر چیز کے درج ہونے کی ایک حکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان جہلا کی تردید ہو جائے جن کے خیال میں اللہ تعالیٰ کو مستقبل کے واقعات کا علم نہیں ہوتا، جیسا کہ اہل کتاب کی محرف بائیبل کا مضمون ہے ''اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا برے ہی ہوتے ہیں، تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔'' (۳/الف) بائبل کے اس (خبیث) مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مستقبل کے احوال سے (معاذ اللہ) بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ عاجز و درماندہ بھی ہے کیوں کہ پچھتاتا وہی ہے جسے حالات پر اختیارِ کلی حاصل نہ ہو۔ لوح محفوظ میں تمام زمانوں اور ادوار کی موجودات اور واقعات کے تفصیلی احوال مذکور ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور علم کامل کا پتہ چلتا ہے۔ لوح

محفوظ کے ''روشن کتاب'' ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام یا اولیائے عظام کی اس پر مستقل نظر ہوتی ہے نہ ہی اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) بھول جانے کا کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس لئے بے ہودہ اور فاسد تاویلات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

کسی ماہر طبیب کو مثلاً سنسکرت زبان پر عبور تو کیا، اسے اس کی ابجد کا بھی علم نہ ہو تو بھی سنسکرت نہ جاننے پر اسے جاہل کہنے والا خود پرلے درجے کا احمق یا مجنون ہے۔ لہٰذا حضرات انبیاء علیہم السلام کی غیر متعلقہ باتوں سے بے خبری اور لاعلمی پر یہ اعتراض خاصا لغو ہے کہ اس لاعلمی سے ان کی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جہالت ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا لغو اعتراض کرنے والا خود جاہل ہی نہیں بل کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔

یہاں ایک زبردست مغالطے سے بھی خبردار رہنا چاہئے جس میں اکثر اہل علم بھی افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ فکری و اعتقادی لغزشوں میں مبتلا حضرات عموماً کہا کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو تخلیق کائنات سے قبل کا اور بروز قیامت لوگوں کے جنت وجہنم میں داخلے کے بعد کا علم حاصل نہیں ہے بل کہ ان دونوں ادوار کے درمیانی دور کا اُنہیں علمِ محیط، تفصیلی وکلی حاصل ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاصل ہے۔ پس جب ہم مخلوق کے علم کو اللہ کے علم کے برابر ہرگز نہیں جانتے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور مخلوق کا عطائی ہے تو یہ عقیدہ شرک یا موہم شرک (شرک کا وہم پیدا کرنے والا) کیسے ہوگیا؟ جواب میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر کوئی چیز کسی بھی مخلوق کو کبھی بھی عطا نہ فرمائی ہو تو اس کے متعلق یہ عقیدہ تراش لینا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز فلاں کو عطا کر رکھی ہے، شرک سے نہیں بچا سکتا۔ مثلاً عیسائیوں کا اپنے پادریوں کے متعلق ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ تمام تکوینی اختیارات کے مالک ہیں۔ وہ جس کی روزی بڑھانا اور گھٹانا چاہیں، وہ جسے اولاد دینا یا نہ دینا چاہیں، وہ بارش برسانا یا نہ برسانا چاہیں، وہ کسی کو ہمیشہ زندہ رکھنا اور امراض سے بچانا چاہیں یا نہ چاہیں، تو اُنہیں مکمل اختیارات حاصل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ بہ قول ان کے باپ (خدا) نے اپنے بیٹے (یسوع مسیح) کو تو سارے اختیارات دے کر خدا بنا دیا لیکن یسوع مسیح (حضرت عیسیٰ) نے اپنے حواریوں اور ان کے بعد نسلاً بعد نسلٍ پاپاؤں کو سارے کے سارے نہیں بل کہ صرف اور صرف تشریعی اختیارات دے رکھے ہیں۔ دین کے اصول وفروع میں پوپ جو کچھ کہے، اسے اس کا پورا اختیار ہے یعنی وہ مختار کل نہیں کہ تکوینی اور تشریعی ہر طرح کے اختیارات اسے دیئے گئے ہوں، اسے صرف تشریعی اختیارات ہی دیئے گئے ہیں۔ اب دیکھئے سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا ان عیسائیوں سے متعلق ارشاد ہے کہ اُنہوں نے اپنے علماء اور

درویشوں کو اور مسیح بن مریم کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے حال آں کہ اُنہیں صرف ایک اکیلے اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جو شرک کرتے ہیں وہ (اللہ) اس سے پاک ہے۔ (۳/ب) یہاں اب غور کیجئے اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے شرک کی وجہ صرف یہی نہیں بتائی کہ وہ حضرت عیسیٰ کو رب بنائے ہوئے ہیں بل کہ اس کے ساتھ ہی یہ وجہ بھی ہے کہ اُنہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو بھی رب بنا رکھا ہے، حال آں کہ عیسائی کبھی بھی اپنی زبان سے اپنے پاپاؤں اور مذہبی پیشواؤں کو رب نہیں کہتے اور کبھی بھی یہ نہیں کہتے کہ اُنہیں (مفروضہ) تشریعی اختیارات ازخود حاصل ہیں۔ وہ ان اختیارات کو عطائی ہی سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مشرک اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی کسی بھی زمانے میں کسی بھی پیغمبر، صحابی، ولی، عالِم اور درویش کو تشریعی اختیارات کا مالک نہیں بنایا۔ شارع حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ پیغمبر کو مجازاً شارع کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے بہ ذریعہ وحی دین کے اصول وفروع معلوم کر کے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔'' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی بھی دور اور کسی بھی زمانے کے لئے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی غیب کلی کا جاننے والا حاضر وناظر اور مختار کل نہیں بنایا ہے۔ فتدبر ولا تکن من الغافلین۔

اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی کوئی محدود اختیار دے رکھا ہو اور کوئی شخص بالفرض غلطی سے یہی محدود اختیار دوسری مخلوق کے لئے بھی تسلیم کرے تو وہ غلطی پر تو ہے لیکن یہ غلطی شرک نہیں۔ مثلاً جنات اور شیاطین کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ وہ آسمانِ دنیا تک پرواز کرتے ہیں اور ملائکہ کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بعض انسانوں کے متعلق بھی یہی سمجھ بیٹھے تو وہ یقیناً غلطی پر ہے۔ لیکن اس کی ایسی غلطی شرک تو نہیں مگر اس معنی میں موہم شرک ہے کہ اس طرح کی بے جا تخیلاتی پروازیں بعض اوقات لوگوں کو واقعی شرک سے آلودہ کر دیتی ہیں۔

ب: جب عقل سلیم کا یہ بدیہی فیصلہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو نزولِ قرآن سے پہلے غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا تھا ورنہ ۲۳ سال کے طویل عرصے تک وحی کے نازل ہوتے رہنے کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی، تو اس کی بھرپور تائید وتوثیق قرآن کریم کے مضامین سے بھی ہو رہی ہے مثلاً سورۂ یوسف میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) ہم تیرے سامنے ایک بہترین بیان پیش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے یہ قرآن تیری طرف وحی کے ذریعے نازل کیا ہے اور یقیناً تو اس سے پہلے (حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کے حالات کے بارے میں) بے خبروں میں سے تھا''۔ (۳/ج) اس سے معلوم ہوا کہ آپ حاضر وناظر بھی نہیں تھے ورنہ ان واقعات سے آپ بے خبر نہ ہوتے۔ اور اسی سورۂ یوسف میں ہے کہ (اے پیغمبر!) یہ

غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان (برادرانِ یوسف) کے پاس نہیں تھا جب اُنہوں نے ایک کام (حضرت یوسفؑ کو حیلے بہانے سے لے جانے اور کنویں میں پھینک آنے) پر اتفاق کرلیا تھا۔ (۴/ الف) حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کی کفالت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا کہ ''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہیں تھا جب وہ اپنی قلمیں (قرعہ اندازی کے لئے) ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی پرورش کرے گا اور تو ان کے پاس نہ تھا جب وہ (اس بارے میں) باہم جھگڑتے تھے'' (۴/ ب) حضرت موسیٰؑ کو نبوت عطا کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''(اے پیغمبر!) تو (کوہ طور کے) غربی کنارے پر نہ تھا جب ہم نے موسیٰ کو حکم احکام کی وحی پہنچائی، نہ ہی تُو وہاں موجود تھا اور نہ ہی تو (دور سے) دیکھنے والوں میں سے تھا لیکن ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں جن پر لمبی مدتیں گزر گئیں اور نہ ہی تو مدین کے رہنے والوں میں سے تھا کہ ان کے ساتھ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا بل کہ ہم ہی رسولوں کے بھیجنے والے رہے اور نہ تو طور کی طرف تھا جب ہم نے (موسیٰ کو) آواز دی بل کہ یہ تیرے رب کی طرف سے (تجھ پر) رحمت ہے (کہ اس نے تجھے رسول بنایا اور امم سابقہ کی خبریں دیں) تاکہ تو ان لوگوں کو (ایمان نہ لانے پر اللہ کے عذاب سے) ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے (حضرت اسماعیلؑ کے بعد) کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تاکہ وہ لوگ نصیحت قبول کریں''۔ (۴/ ج) اور اسی سورۂ قصص میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تجھے تو کبھی اس کا خیال بھی نہ گزرا تھا کہ تیری طرف کتاب نازل کی جائے گی لیکن یہ (قرآن) تیرے رب کی مہربانی سے (تجھ پر) اُترا''۔ (۵/ الف) اور سورۂ شوریٰ میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے روح (قرآن کریم جس سے مردہ دلوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے) کو اُتارا ہے، اس سے پہلے تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے؟'' (یعنی آپ کو نزولِ قرآن سے پہلے اس کا اور ایمان کی تفصیلات کا علم نہیں تھا۔) (۵/ ب) سورۂ ہود میں حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جن کی وحی ہم تیری طرف کر رہے ہیں اس سے پہلے ان خبروں کو نہ تو جانتا تھا اور نہ ہی تیری قوم کو ان کا علم تھا''۔ (۵/ ج) اس طرح کے قرآنی مضامین سے بہ خوبی ثابت ہو رہا ہے کہ نزولِ قرآن سے پہلے رسول اکرم ﷺ امم سابقہ کے احوال سے بے خبر تھے اور آپ کسی طرح بھی ان ادوار میں حاضر و ناظر نہیں تھے۔ (الم تر) (کیا تو نے دیکھا نہیں؟) جیسے کلمات سے ہمیشہ آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں ہوتا بل کہ لسانی محاورات کے مطابق معنی یہ ہے کہ ''کیا تجھے معلوم نہیں؟'' مثلاً سورۂ یٰس میں ہے اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُوْنِ (۶/ الف) ''کیا اُنہوں

نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قومیں ہلاک کر ڈالیں؟۔'' یہاں جن لوگوں کو ان قرون اولیٰ کی قوموں کے تباہ ہونے کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے وہ ان قوموں کی تباہی کے وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ایسے کلمات سے کسی کا بھی حاضر و ناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ''واذ'' (اور جب) جیسے کلمات سے بھی کسی کا حاضر و ناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں یہودیوں کو کہا گیا ہے وَاِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۶/ب) ''اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی تھی۔'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدینے کے یہ یہودی حاضر و ناظر تھے اور فرعون کے زمانے کے تمام مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

ج: چوں کہ نزول قرآن سے پہلے اور نزول قرآن کی کوئی ۲۳ سالہ طویل مدت کے درمیان رسول اللہ ﷺ کا عالم جمیع ما کان و ما یکون نہ ہونا بہ خوبی واضح ہو چکا تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن قرآنی آیات سے آپ کو کچھ لوگ بہ زعم خویش عالم الغیب بنا دیا جانا ثابت کرتے ہیں، ایسا استدلال قطعاً باطل اور قرآن کریم کی معنوی تحریف کے مترادف ہے کیوں کہ ایسی آیات آخری وحی کی آیات نہیں ہیں بل کہ ان کے بعد بھی قرآن برابر نازل ہوتا رہا۔ اگر ان آیات سے آپ کو غیب کلی کا (مفروضہ) علم دیا گیا ہوتا تو باقی ماندہ قرآن کے نزول کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

۲۔ بہ حوالہ اہانتِ انبیاء علیہم السلام

الف: رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام مثلاً حضرت آدمؑ کو غیب کلی کا علم دیا گیا تھا یا نہیں؟ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو اس (مفروضہ) عقیدے سے رسول اللہ ﷺ کی سخت توہین لازم آتی ہے کیوں کہ ہم سابقہ مباحث میں یہ تسلیم کر چکے ہیں اور تسلیم کئے بغیر چارہ بھی نہیں کہ نزول قرآن کی تقریباً ۲۳ سالہ مدت کے دوران آپ کو غیب کلی کا علم عطا نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا مکمل نزول قرآن کے بعد آپ کیلئے غیب کلی کا علم تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت آدمؑ کو تو ہزاروں برس پہلے سے علم غیب حاصل تھا جب کہ آپ کو غیب کلی کا یہ (مفروضہ) علم مکمل نزول قرآن کے بعد کوئی اواخر ۱۰ ہجری یا اوائل ۱۱ ہجری میں حاصل ہوا۔ بالفاظ دیگر حضرت آدمؑ کے غیب کلی جاننے کی مدت رسول اکرم ﷺ کے غیب کلی جاننے کی مدت سے کہیں زیادہ طویل ہوگئی۔ یہاں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انبیائے سابقین کو غیب کلی کا یہ (مفروضہ) علم رسول اکرم ﷺ کے ذریعہ حاصل ہوا تھا کیوں کہ جب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ مکمل نزول قرآن سے پہلے آپ ﷺ کو غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا تھا ورنہ نزول قرآن کی ضرورت ہی نہ رہتی، تو

جب آپ خود غیب کلی نہیں جانتے تھے تو دوسروں کو اس کی تعلیم کیسے دے سکتے تھے؟ جس عقیدے سے رسول اکرم ﷺ کی یوں توہین لازم آتی ہو اس کے باطل اور نامعقول ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔ پس دوسری شق ہی درست ہے کہ انبیائے سابقین عالم الغیب نہیں تھے۔

ب: رسول اکرم ﷺ کا علم دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں زیادہ ہوگا یا (معاذ اللہ) کم ہوگا یا برابر ہوگا۔ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو بالاتفاق یہی درست ہے اور باقی دونوں شقیں باطل ہیں۔ اب اگر سب انبیاء علیہم السلام کے عالم الغیب ہونے کا (مفروضہ) عقیدہ درست ہو تو کسی بھی عالم الغیب سے کوئی بھی چیز کسی بھی وقت مخفی نہیں رہ سکتی، لہٰذا اس صورت میں جملہ انبیاء علیہم السلام کا علم بالکل مساوی ہو جائے گا اور اس میں باہم رتی بھر کی بھی کمی یا بیشی نہیں ہوسکتی، حال آں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا علم دیگر انبیاء علیہم السلام سے زیادہ ہے۔ جب سب انبیاء علیہم السلام کیلئے غیب کلی کے علم کا عقیدہ اختیار کرنے سے رسول اکرم ﷺ کا دوسروں سے افضل ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا تو ایسا (مفروضہ) عقیدہ ہی باطل ہے جس سے آپ کی توہین لازم آئے۔ اس سے یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ مخلوق کو حتیٰ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ انہیں غیبی جزئیات پر حسب ضرورت وموقع مطلع کیا جاتا ہے۔ یہ غیبی جزئیات اپنی قدر وقیمت، کیفیت اور کمیت (Quality & Quantity) کے اعتبار سے یک ساں نہیں، تب ہی تو سب پیغمبر ایک ہی درجے کے نہیں بل کہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اگر سب کو غیب کلی کا علم دیا گیا ہوتا تو سب کا علم بالکل یک ساں اور مساوی ہوتا، سب کے مدارج یک ساں اور مساوی ہو جاتے۔ اگر یہاں یہ تاویل کی جائے کہ فضیلت کا معیار صرف علم ہی نہیں بل کہ تقویٰ ہے تو پیغمبروں کو (باطل عقیدے) کی رو سے مختارکل بھی قرار دیا جاتا ہے۔ ہر مختار مطلق کو ہر کمال کے حصول پر لازماً قادر ہونا چاہئے۔ لہٰذا ایسی کوئی تاویل یہاں کارگر نہیں ہوسکتی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی توہین سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ اس سچے عقیدے کو قبول کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے کسی کو بھی غیب کلی پر مطلع نہیں فرمایا ہے، بل کہ غیب جزئی پر مطلع فرمایا ہے اور مخلوق کا یہ عطائی علم باہم یک ساں نہیں ہے۔ اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں، صحابہ کرامؓ یا اولیائے عظام ہوں، وہ باہم برابر نہیں بل کہ ان کے مراتب ومدارج میں تفاوت ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ یہی عقل سلیم کا فیصلہ ہے اور اسی کی تعلیم قرآن وسنت سے ملتی ہے۔

ج: رسول اکرم ﷺ کے بعد انبیائے کرام کا سلسلہ تو ختم ہوا لیکن اولیاء تو پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان اولیاو صلحاء کو غیب کلی کا علم دیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو یہی حق ہے، ورنہ ان کے اور حضرات انبیاء علیہم

السلام کے علم میں رتی بھر کمی یا بیشی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ عالم الغیب سے تو کوئی چیز بھی مخفی نہیں رہ سکتی۔ پس اولیاء کو عالم الغیب قرار دینے سے ان کے علم کی پیغمبروں کے علم کے ساتھ مکمل مساوات لازم آئے گی۔ جس (مفروضہ) عقیدے سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی توہین ہوتی ہو ایسا عقیدہ یقیناً باطل ہے۔ یہاں یہ عذر بھی بے معنی ہوگا کہ ان اولیاء کو غیب کلی کا علم رسول اکرم ﷺ نے عطا فرمایا ہے، لہٰذا آپ معلم ٹھہرے اور آپ کا اولیاء سے افضل ہونے کا مرتبہ خلل پذیر نہ ہوا، کیوں کہ اس (مفروضہ) صورت میں بھی یہ تو لازماً ماننا پڑے گا کہ اولیاء کا علم دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے علم کے بالکل برابر ہے۔ یہ کہنا لغو ہوگا کہ سب کے سب انبیاء کرام اکٹھے بہ یک وقت اولیاء کو علم الغیب سکھاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ایک ہی (مفروضہ) عالم الغیب اور مختار مطلق کافی ہونا چاہئے۔ پس جس عقیدے سے سب انبیاء کی یا بعض کی یا کسی ایک نبی کی بھی توہین لازم آتی ہو، ایسا عقیدہ باطل ہے۔

دنیا (مفروضہ) غیب جاننے والے اولیاء سب کو نہیں تو کم از کم اپنے مسلمان بھائیوں کو تو مستقبل کے ناخوش گوار حوادث کے متعلق قبل از وقت بتادیا کریں تا کہ ان کے مسلمان بھائی اپنے محدود اختیار اور ماتحت الاسباب (اختیاری اسباب کے تحت) خطرات سے اپنے آپ کو بچالیا کریں۔ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہوئے محسوس کریں کہ سانپ بچے کو ڈس لے گا یا اندھا شخص کنویں میں گر جائے گا تو ہمارا فرض ہے کہ نماز چھوڑ کر بچے اور نابینے کی جان بچائیں، نماز بعد میں پوری کریں۔ اگر ان اولیاء کو اللہ تعالیٰ نے منع کر رکھا ہے کہ تم لوگوں کو ناخوش گوار حوادث سے بچانے کے لئے انہیں پیشگی اطلاع نہ دیا کرو تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بہ ذریعہ وحی ہوگا یا ان اولیاء کو الہام ہوتا ہوگا۔ اگر ان اولیاء پر (نعوذ باللہ) وحی نازل ہوتی ہے تو عقیدۂ ختم نبوت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اگر انہیں الہام ہوتا ہے تو خلاف شرع الہام پر عمل حرام ہے۔ پس اولیاء کو بھی غیب کلی کا علم حاصل نہیں ہے۔ نیز حضرات انبیاء علیہم السلام کسی بھی صحیح عقیدے کو ہرگز نہیں چھپاتے، عقائد کو نہ تو وہ اسرار قرار دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں ابہام و کتمان، تقیے اور توریے سے کام لیتے ہیں کہ کہیں کچھ اور مراد کچھ اور ہو۔ اب دیکھئے حضرات انبیاء علیہم السلام نے غیب کلی کا علم عطا ہونے کا دعویٰ کیا ہوگا یا نہیں۔ اگر نہیں تو یہی حق ہے۔ اگر دعویٰ کیا تھا اور اگر اولیائے کرام کو بھی غیب کلی کا (مفروضہ) علم واقعی عطا کیا جاتا ہے تو انہیں بھی سنت انبیاء پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے متعلق ایسا دعویٰ ضرور کرنا چاہئے تا کہ لوگوں کے عقائد درست ہوں۔ اولیاء تو ہر زمانے کی طرح آج بھی موجود ہو سکتے ہیں تو وہ ایسا دعویٰ کرنے سے آخر شرماتے کیوں ہیں؟ فخر و مباہات سے وہ بچتے ہوں تو ایسا دعویٰ وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں یہ نعمت عطا کر رکھی ہے۔ اگر ایسا کوئی

مدعی ہے تو اسے از خود سامنے آنا چاہئے۔ اگر ایسے بزرگ خود سامنے آنے سے شرماتے اور کتراتے ہیں تو جو لوگ اولیاء کی غیب دانی کے مدعی ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی مساجد میں غیب کلی نہ جاننے والے ناقص ائمہ کے پیچھے نماز نہ پڑھیں اور غیب دان حضرات کو ہر قیمت پر ڈھونڈیں۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو مخلوق کے لئے غیب کلی ثابت کرنے کے غلط عقیدے کو خیر باد کہیں۔

ھ: سواد اعظم اہل سنت کے نزدیک صحابہ کرامؓ میں اجتہادی اختلافات موجود تھے اور سواد اعظم کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ امت کا بڑے سے بڑا ولی کسی چھوٹے سے چھوٹے درجے کے صحابی کے مرتبے کو بھی ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ اب دیکھئے صحابہ کرامؓ کو غیب کلی کا علم عطا ہوا تھا یا نہیں۔ اگر نہیں تو یہی حق ہے۔ اگر عطا ہوا تھا تو چوں کہ عالم الغیب سے کسی وقت بھی کوئی بھی چیز ہرگز مخفی نہیں رہ سکتی، لہٰذا صحیح اور غلط اولیٰ اور خلاف اولیٰ، افضل اور مفضول میں تمیز کر لینا ہرگز ان کے لئے مشکل نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں صحابہ کرامؓ کے لئے اس (مفروضہ) صورت میں کسی طرح کے بھی اجتہادی اختلاف کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ اگر صحابہ کرام غیب دان نہیں بنائے گئے تھے تو اولیاء کا درجہ تو ان سے کم ہے، یہ اولیاء کیسے غیب دان بن گئے؟ جب ان مباحث میں یہ ثابت ہو چکا کہ نزول قرآن کی تقریباً ۲۳ سالہ مدت کے دوران رسول اللہ ﷺ کو غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا تھا تو جو صحابہ کرامؓ اس مدت کے دوران وفات پا گئے تو وہ بھلا کیسے عالم الغیب ہو سکتے ہیں؟ مثلاً سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تھے اور عالم الغیب نہیں تھے۔ اب اگر اولیاء کو غیب کلی کا (مفروضہ) علم دیا گیا ہے اور غیب کلی کا یہ علم مخلوق کے لئے واقعی کمال ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ان اولیاء کا مقام و مرتبہ سیّد الشہداء حضرت حمزہؓ سمیت سب ہی ان صحابہ کرامؓ سے کہیں بڑھ کر ہے جو نزول قرآن کی مدت پوری ہونے سے پہلے انتقال فرما چکے تھے۔ لیجئے غیب کلی کے اس (جھوٹے) عقیدے سے رسول اکرم ﷺ کی خصوصاً اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی عموماً توہین تو ہو ہی رہی ہے، اس توہین سے صحابہ کرامؓ بھی (معاذ اللہ) محفوظ نہ رہ سکے۔ بل کہ اولیاء بھی توہین سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظام کو اگر واقعی غیب کلی کا علم دیا گیا ہے تو ان کے علم میں بھی مکمل مساوات ماننی پڑے گی اور سب کا درجہ باہم برابر ہوگا۔ اگر بڑے صحابی کو چھوٹے صحابی کے اور بڑے ولی کو چھوٹے ولی کے برابر کر دیا جائے تو اس میں یقیناً بڑوں کی توہین لازم آتی ہے۔

و: اگر کوئی شخص بہ زعم خویش زیادہ ذہانت و فطانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ شق اختیار کرے کہ صرف اور صرف رسول اکرم ﷺ ہی کو غیب کلی کا علم دیا گیا ہے، لہٰذا آپ کو عالم جمیع ما کان و ما یکون قرار دینے سے آپ کی توہین نہیں ہوتی بل کہ آپ کی عظمت و سطوت میں اضافہ ہوتا ہے تو اگرچہ ایسا عقیدہ

رکھنے والا کوئی شخص شاید آج تک ظاہر نہیں ہوا، پھر بھی یہ شق باطل ہے۔ اس صورت میں بھی لازماً آپ کی توہین وتنقیص ہوتی ہے اوّلاً اس لئے کہ ہم ان شاء اللہ العزیز آئندہ مباحث میں بہ طریق احسن یہ ثابت کردیں گے کہ غیب کلی کا علم خالق کے لئے تو ناگزیر ہے مگر مخلوق کے لئے سرے سے کمال ہے ہی نہیں۔ ثانیاً جس (غلط) استدلال سے رسول اکرم ﷺ کے لئے غیب کلی کا علم بہ زعم خویش ثابت کیا جاتا ہے بعینہٖ اسی استدلال سے حضرت موسیٰ کو بھی عالم الغیب ماننا پڑے گا۔ تورات کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو نیک عمل کرنے والوں کے لئے پوری نعمت تھی وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اور اس میں ہر چیز کی تفصیل تھی''۔ (۶/ ج) سورۂ اعراف میں تورات کے متعلق ہے کہ ''ہم نے اس (موسیٰ) کو (تورات کی) تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کی تفصیل لکھ کر دی تھی''۔ (۷/ الف) اسی طرح کا مضمون قرآن کریم کے متعلق بھی ہے مثلاً سورۂ یوسف میں ہے کہ ''قرآن وہ بات نہیں جو گھڑی گئی ہو بل کہ اگلی کتابوں کی تصدیق ہے۔ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اور ہر چیز کی تفصیل ہے''۔ (۷/ ب) اور سورۂ نحل میں ہے ''اور ہم نے تیری طرف کتاب اُتاری تبیاناً لکل شئی جو ہر چیز کا روشن بیان ہے۔ (۷/ ج) سورۂ انعام میں ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۸/ الف) کہ ''ہم نے کتاب میں کوئی چیز اُٹھا نہ رکھی''۔ قرآن کریم کے تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اور وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہونے کا بعض حلقوں میں (نہایت غلط) مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ چوں کہ یہ وصف پورے قرآن کا ہے لہٰذا نزولِ قرآن کی مدت کے دوران رسول اللہ ﷺ کو بہ تدریج علم غیب دیا جاتا رہا اور جب پورا قرآن نازل ہو چکا تو آپ عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر بنائے جا چکے تھے۔ اس (جھوٹے) مفروضے کو تسلیم کرلیا جائے تو غور کیا جائے یہی وصف تورات کا بھی ہے تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ پوری تورات مل جانے کے بعد حضرت موسیٰ بھی عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر ہو گئے تھے۔

اس سے رسول اللہ ﷺ کی سخت توہین لازم آتی ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آپ ﷺ سے کوئی انیس سو برس پہلے کا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ کو تو غیب کلی کا (مفروضہ) علم سیکڑوں برس پہلے دیا جا چکا تھا جب کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ (مفروضہ) علم ۱۰ ہجری کے اواخر یا ۱۱ ہجری کے اوائل میں دیا گیا۔ یوں حضرت موسیٰ کے غیب کلی جاننے کی مدت نسبتاً کہیں زیادہ طویل ہوگئی۔ ثانیاً اس لئے کہ عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر سے کسی بھی طرح کی کوئی بھی چیز کسی بھی وقت مخفی نہیں رہ سکتی، لہٰذا حضرت موسیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے علم میں مکمل مساوات لازم آئے گی۔ ثالثاً اس لئے کہ حضرت موسیٰ کو جو علم کوہِ طور پر چالیس راتوں میں حاصل ہوگیا وہی اور اتنا ہی علم حاصل کرنے میں رسول اللہ ﷺ کو ۲۳

سال لگ گئے۔ رابعاً اس لئے کہ اس صورت میں یہ بھی ماننا ہوگا کہ تورات اور قرآن کریم کے مضامین بالکل یک ساں اور مساوی ہیں۔ ان میں بال برابر بھی کوئی فرق نہیں حال آں کہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ پس مذکورہ بالا آخری شق بھی باطل ہوگئی۔

امامیہ حضرات کی چوٹی کی کتاب اصول کافی میں ایک دل چسپ (مگر جھوٹی) روایت موجود ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؒ نے فرمایا کہ اگر میں موسیٰ اور خضرؑ کے پاس (ان کی باہم ملاقات کے موقع پر) ہوتا تو میں اُنہیں بتلا دیتا کہ میں ان دونوں سے بڑا عالم ہوں، میں جانتا ہوں جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور میں جانتا ہوں جو جنت اور جہنم میں ہے اور جو کچھ ہو چکا اور جو آئندہ ہوگا میں اس سب کو بھی جانتا ہوں جب امامؒ نے دیکھا کہ ان کی یہ بات لوگوں پر گراں گزر رہی ہے تو فرمایا کہ میں نے یہ سب کچھ کتاب اللہ (قرآن کریم) سے معلوم کیا ہے جو تِبیَانُ کُلِّ شَیءٍ (ہر چیز کو بیان کرنے والے) کے وصف کی حامل ہے۔ (۸/ ب) اس جھوٹی روایت کو قبول کرلیا جائے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ امام جعفر صادقؒ عالم الغیب تو کیا ہوتے، اُنہوں نے تو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کبھی قرآن شریف بھی پورا نہیں پڑھا تھا ورنہ اُنہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ ''ہر چیز کا بیان'' اور ''ہر چیز کی تفصیل'' صرف قرآن کریم کا ہی وصف نہیں بل کہ قرآن کریم میں تورات کے بھی یہی اوصاف مذکور ہیں جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے تو حضرت موسیٰ کو بھی اسی دلیل کی رو سے عالم جمیع ما کان و ما یکون ہونا چاہئے تھا جسے امام صاحبؒ (بہ قول ان جھوٹے راویوں کے) اپنے حق میں دلیل قرار دے رہے ہیں۔ کبھی سنگریزوں میں موتی بھی مل جاتے ہیں۔ اسی اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادقؒ کا ارشاد ہے کہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ہم غیب جانتے ہیں حال آں کہ اللہ عزوجل کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ میں نے اپنی فلاں لونڈی کو مارنے کا ارادہ کیا تھا فھربت منی وما علمت فی ای بیوت الادارھی (۸/ ج) ''تو وہ مجھ سے بھاگ نکلی اور مجھے یہ علم نہ ہوسکا کہ وہ گھر کے کس کمرے میں ہے؟''

قرآن کریم میں ہر چیز کی تفصیل اور ہر چیز کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں دین کے تمام اصولی اور ضروری مسائل و مضامین نہایت تفصیل سے بیان کر دیئے گئے ہیں جن سے لوگوں کی صراط مستقیم پر گام زن ہونے کی دنیوی سعادت اور جہنم سے بچنے اور جنت میں داخل ہونے کی اُخروی سعادت وابستہ ہے۔ چناں چہ عقائد توحید، رسالت، آخرت اور ان کے لازمی تقاضوں کو قرآن کریم میں نہایت ہی تفصیل سے، مختلف انداز اور طریقوں سے، مختلف ضرب الامثال سے، امم ماضیہ اور انبیائے سابقین کی تعلیم اور ان کے احوال کے حوالے سے، ان اقوام کے آثارِ قدیمہ سے، فطرت کے مظاہر و مناظر پر مبنی مشاہداتی و تکوینی

دلائل سے، نقلی اور عقلی شواہد سے ایک دو مرتبہ نہیں بل کہ بار بار بیان کیا گیا ہے۔ سیکڑوں مرتبہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے، آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے، غیب کا پورا علم صرف اور صرف اسی کے پاس ہے، قیامت کے وقت کو وہی جانتا ہے اور وہ اس کے وقت کو مخلوق سے مخفی رکھنا چاہتا ہے، وہ ہر چیز پر گواہ ہے، وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے، وہی شہید و بصیر یعنی اپنی شان اور مرتبے کے مطابق حاضر و ناظر ہے، وہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز پر قادر ہے، وہی مختار مطلق ہے، وہی سب کو روزی دیتا ہے، وہی تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ وغیرہ وغیرہ، ایسے مضامین قرآن کریم میں بہ کثرت اور بہ تکرار موجود ہیں۔ کسی بھی مخلوق حتیٰ کہ بعد از خدا بزرگ توئی کے مصداق خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے متعلق بھی اس طرح کے نہایت کھلے، روشن، واضح اور محکم مضامین قرآن کریم میں ہرگز ہرگز نہیں لائے گئے۔

قرآن کریم اس معنی میں بھی مفصل کتاب ہے کہ اس میں جو اوامر و نواھی وغیرہ ہیں ان کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و فعل یعنی اپنی سنت سے فرمادی ہے۔ اجماع امت اور قیاس شرعی سے جو احکام و مسائل معلوم ہوتے ہیں ان کا اصل ماخذ و مصدر بھی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہی ہے۔ یوں شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اوّلین ماخذ و مرکز قرآن کریم ہے۔ باقی تینوں مآخذ و مصادر سنت، اجماع اور قیاس اسی کتاب اللہ ہی کی تفصیل ہیں۔ بالفاظ دیگر سب کی سب دینی جزئیات قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی مقدار، نمازوں کے اوقاتِ خمسہ کی پوری تفصیل، اذان و اقامت کے کلمات، نمازوں کی رکعات کی تعداد اور نماز ادا کرنے کا پورا طریقہ، عیدالفطر کا یکم شوال کو اور عیدالاضحیٰ کا ۱۰ ذی الحجہ کو ہونا، مناسک حج کی تفصیل وغیرہ وغیرہ لاتعداد جزئیات قرآن کریم کے متن میں فرداً فرداً مذکور نہیں ہیں ورنہ قرآن کریم کئی ضخیم جلدوں میں ہوتا اور لوگوں کے لئے اس کی صدری حفاظت سخت دشوار ہوتی۔ یہ تمام دینی جزئیات قرآن کریم میں اصولاً یوں مذکور ہیں کہ ''رسول (دین کے متعلق) جو کچھ تمہیں دے، اسے قبول کرو اور جن کاموں اور باتوں سے وہ منع کردے ان سے رک جاؤ۔'' (۹/الف) قرآن کریم میں وہ امور بھی مذکور نہیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے مخفی رکھا ہے۔ سورۂ مومن میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے احوال ہم نے تجھ سے بیان کئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تجھ پر بیان نہیں کئے۔'' (۹/ب) اس سے صاف معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں سب کے سب انبیاء علیہم السلام کے حالات مذکور نہیں بل کہ صرف بعض کے ہی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اب اگر یہاں یہ (غلط) تاویل کی جائے کہ ان کے احوال و کوائف اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ پر منکشف فرما

دیئے تھے تو بھی یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ قرآن کریم کے مفصل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں ہر ہر چیز اور ہر ہر بات لازماً موجود ہے یا اگر کسی چیز اور کسی اور کسی علم کا ذکر کیا بھی گیا ہے تو لازماً اس کی تمام متعلقہ تفصیلات بھی موجود ہیں سورۂ ابراہیم میں ہے کہ کیا تمہارے پاس تم سے پہلے کے لوگوں کی خبریں نہیں آئیں؟ یعنی قوم نوح کی اور عاد اور ثمود کی وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ (۹/ ج) ''اور جو لوگ ان کے بعد آئے اُنہیں اللہ کے سوا اور کوئی (ٹھیک ٹھیک) نہیں جانتا۔'' سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ ''بے شک قیامت آنے والی ہے اور میں اسے مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو اس کی (اچھی یا بری) کمائی کا بدلہ دیا جائے۔'' (۱۰/ الف) سورہ النازعات میں ہے کہ ''یہ لوگ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کب واقع ہوگی، (اے پیغمبر!) تیرا اس کے بیان سے (بھلا) کیا تعلق ہے؟'' (۱۰/ ب) سورۂ سجدہ میں ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا جو کچھ ان (جنتیوں) کیلئے مخفی رکھا گیا ہے جس میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) ہے۔'' (۱۰/ ج) سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ ''یہ لوگ تجھ سے روح (کی حقیقت اور ماہیت) کے متعلق پوچھتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تو (ان سے) کہہ دے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔'' (۱۱/ الف) سورہ یٰس میں ہے کہ ''ہم نے اس (پیغمبر) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اس (کی شان) کے لائق ہے۔'' (۱۱/ ب) اگر یہ (غلط) دعویٰ کیا جائے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو ان تمام باتوں کا علم تھا یا خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو بعد میں کسی مرحلے پر ان کا علم عطا کر دیا گیا تھا تو ایسے غلط دعوے کا تعاقب تو آئندہ سطور میں ان شاء اللہ العزیز مناسب مقام پر ہوگا، یہاں سردست یہ تو بہ خوبی واضح ہو ہی گیا کہ مذکورہ بالا امور کی تعلیم و تفصیل قرآن کریم میں مذکور نہیں۔ پس قرآن کریم میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہونے سے دین کے متعلق ضروری اور اصولی امور کی تفصیل مراد ہے۔ استغراق حقیقی (ہر چیز کا احاطہ اور استیعاب) مقصود نہیں۔ عربی کلمات ''من، ما، کل، جمیع وغیرہ'' سے ہر جگہ حقیقی استغراق مراد نہیں لیا جاتا۔ مثلاً سورۂ سبا میں قوم سبا کی ملکہ کے متعلق ہے واوتیت منکلّ شیء (۱۱/ ج) ''اور اسے ہر چیز دی گئی تھی'' یہاں اس دور کے تمام لوازم حکومت کا دیا جانا مراد ہے یہ مطلب نہیں کہ ملکہ سبا کو نبوت بھی دی گئی تھی یا اسے داڑھی اور مردانہ اعضا بھی دیئے گئے تھے۔ قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے عذاب کی جو انتہائی تند و تیز ہوا بھیجی اس کے متعلق سورۂ احقاف میں ہے تدمر کلّ شیء (۱۲/ الف) ''(یہ ہوا) ہر چیز کو تہس نہس کر رہی تھی۔'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس ہوا سے زمین و آسمان وغیرہ، حضرت ہود علیہ السلام کے مومن ساتھی اور خود حضرت ہود علیہ السلام بھی (معاذ اللہ) تباہ ہو گئے تھے۔ یہاں بھی کلمہ ''کُل'' سے سب کی سب اشیا نہیں بل کہ بعض متعلقہ اشیا ہی

مراد ہیں۔

قرآن کریم کی آیات کی تعداد چھ ہزار سے کچھ زائد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محدود تعداد ہے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کے کلمات کی کثرت اور ان کے تنوع کا یہ حال ہے کہ مخلوق کے لئے ان کا احاطہ اور استیعاب قطعاً محال ہے۔ مثلاً سورۂ لقمان میں ہے کہ ''اگر روئے زمین کے سب درخت قلمیں ہو جائیں اور تمام سمندر (لکھنے کی روشنائی ہو جائیں) اور ان کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے۔ بے شک اللہ عزیز (اور) حکیم ہے۔'' (۱۲/ب) کلمات کی یہ کثرت اللہ تعالیٰ کے عزیز (غالب اور زبردست) ہونے پر اور بہ قدر ضرورت انبیاء علیہم السلام پر ان کا نزول اس کے حکیم (صاحب حکمت) ہونے پر دلیل ہے۔ پس قرآن کریم میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہونے سے استغراق حقیقی مراد نہیں بل کہ لوگوں کی دنیوی اور اخروی سعادت کے لئے جو کچھ کافی، شافی اور وافی ہے، اسی کے مطابق کلماتُ اللہ کا رسول اکرم ﷺ پر حسب موقع وضرورت نزول ہوا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ ''کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اُتاری جس کی ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں، رحمت ونصیحت ہے۔'' (۱۲/ج)

رسول اللہ ﷺ پر اُترنے والی ''تنزیلی آیات'' کے مقابلے میں کائنات کی تمام موجودات اللہ تعالیٰ کی ''تکوینی آیات'' ہیں کیوں کہ ہر موجود شے کا لازماً کوئی موجد یعنی ان کا پیدا کرنے والا بھی ہونا چاہئے۔ اسی معنی میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ موجودات اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے یکتا ولاشریک ہونے پر دلیل کا کام بھی دیتی ہیں۔ گو ان کی تخلیق کے دیگر کوئی بھی مقاصد ہوں۔ کوئی بڑے سے بڑا ماہر طبیعات (سائنس دان) ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دیگر سیاروں اور ستاروں کو چھوڑ کر وہ صرف کرۂ ارض کی تمام موجودات اور ان کے متعلق معلومات کا احاطہ کر چکا ہے، حال آں کہ یہ کرۂ ارض جس شمسی نظام سے وابستہ ہے، پوری کائنات کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے ناقابل یقین حد تک وسیع وعریض صحرا کی ریت کے بے حد وحساب ذرات میں سے صرف ایک ذرے کو لے لیا جائے۔ موجودات کا احاطہ تو ایک طرف رہا، جن موجودات کا عام لوگوں کو عموماً اور ماہرین کو خصوصاً علم ہو سکا ہے، ان کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان موجودات کے کیمیائی اجزا اور ان کے طبعی خواص کا پورا پورا ناقابل خطا علم اُنہیں حاصل ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان موجودات کا لوگوں کی ضرورت اور رہ نمائی کے مطابق قرآن کریم میں اکثر وبیشتر یوں حوالہ دیا گیا ہے کہ اُنہیں ان خارجی مناظر ومظاہر کے تحت لایا گیا ہے جو لوگوں کے روزمرہ کے مشاہدے اور تجربے میں ہیں اور جن پر غور کرنا ان کے لئے آسان ہے۔ ان مناظر فطرت کو

تمام موجودات کا جامع عنوان بنایا گیا ہے۔ موجودات میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے کہ ''آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، رات اور دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو سمندروں میں لوگوں کے لئے نفع بخش چیزیں (سامانِ تجارت وغیرہ) لے کر چلتی ہیں، اور (بارش کے) پانی میں جو اللہ نے آسمان (کی طرف) سے اُتارا اور پھر اس کے ذریعے زمین کو اس کے مر جانے (بنجر ہو جانے) کے بعد زندہ کیا (یعنی سرسبز و شاداب کیا) اور اس میں ہر طرح کے جان دار پھیلا دیئے، ہواؤں کے چلنے میں اور آسمان و زمین کے درمیان مسخر بادل میں عقل مندوں کے لئے (اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید ذات وصفات پر) نشانیاں موجود ہیں۔'' (۱۳/الف) اس سے بھی واضح ہوا کہ قرآن کریم میں ہر چیز کی تفصیل ہونا استغراق حقیقی کو ظاہر نہیں کرتا۔ چناں چہ ان موجودات سے متعلق ایسے امور بیان کرنا جن کا کوئی دینی اور دنیوی فائدہ نہیں، ایک عبث اور لایعنی کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کا کلام ہر طرح کے عیب سے پاک ہے۔ تمام موجودات خواہ اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ اپنے موجد و خالق یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے یکتا ہونے پر دلیل ہیں۔ مثلاً کسی مخلوق میں یہ طاقت نہیں کہ وہ مکھی اور مچھر جیسی حقیر مخلوق کو ہی پیدا کر سکے۔ لیکن ان موجودات کے متعلق اس طرح کی تفصیلات کہ مثلاً فلاں جگہ روزانہ اتنی مکھیاں پیدا ہوتی اور اتنی مرتی ہیں، فلاں شہر کی مرغیاں روزانہ اتنے انڈے دیتی اور اتنی مرتبہ بیٹ کرتی ہیں، فلاں جگہ یا فلاں وقت درختوں کے اتنے پتے روزانہ گرتے ہیں، فلاں فلاں جان دار اتنی مرتبہ روزانہ جفتی کرتے اور اتنی مرتبہ بول و براز کرتے ہیں وغیرہ لاتعداد امور اگر کسی مخلوق کے کلام میں پائے جائیں تو ایسے کلام کو مضحکہ خیز اور عبث قرار دیا جائے گا، چہ جائے کہ خالق کے کلام قرآن کریم میں اُنہیں اس دعوے کے تحت ڈھونڈا جائے کہ اس میں ہر ہر چیز کی پوری پوری تفصیل موجود ہے۔ قرآن کریم تو صرف اور صرف لوگوں کی دینی رہ نمائی کے لئے نازل ہوا ہے اس میں ایسی چیزوں کی بھرمار نہیں ہو سکتی جو لوگوں کے لئے سراسر غیر متعلق یا غیر ضروری ہوں یا اگر دنیوی ضرورتوں کے لحاظ سے ضروری اور مفید بھی ہوں لیکن عقل و حواس، تجربے اور مشاہدے سے معلوم ہو سکتی ہوں اور ان کے لئے اصطلاحی وحی کی ضرورت نہ ہو۔ لوح محفوظ کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔

خارجی کائنات کے مسلسل مشاہدات و تجربات سے لوگ قوانینِ فطرت کو معلوم کرتے ہیں اور ان قوانین فطرت کو دنیوی زندگی میں اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کے طریقے بھی معلوم کرتے ہیں۔ نئی نئی دریافتیں اور ایجادات سامنے آتی رہتی ہیں۔ مشاہدات و تجربات سے برآمد ہونے والے نتائج و ثمرات نسلاً بعد نسلٍ نوعِ انسانی میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا ان امور کے لئے (پیغمبر پر نازل ہونے والی)

اصطلاحی وحی کی ضرورت نہیں۔ مظاہر فطرت اور ان سے معلوم شدہ حقائق کا اجمالی اور اصولی تذکرہ قرآن کریم میں اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان سے توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد وغیرہ اہم دینی مسائل پر تکوینی و آفاقی دلائل قائم کئے جاسکیں۔ یعنی مادی طبیعی علوم یہاں مقصود بالذات نہیں بل کہ مقصود بالغیر ہیں۔ جن غیر متعلقہ امور پر دینی اصول وفروع کا سمجھنا اور سمجھانا موقوف نہ ہو، وہ قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں گو یہ امور دنیوی زندگی کے لئے کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں۔ چناں چہ کسی طبیب کو قرآن کریم میں مثلاً سونے چاندی اور فولاد جیسی دھاتوں کی تکلیس (کشتہ سازی) کے نسخے نہیں ملیں گے۔ کسی جغرافیہ دان کو اس میں مختلف شہروں کے محل وقوع اور ان کے طول بلد اور عرض بلد نہیں ملیں گے، کسی ریاضی دان کو اس میں حسابی کلیات اور ہندسی اشکال کی تفصیل نہیں ملے گی، کسی سائنس دان اور موجد کو اس میں جوہری بم بنانے کے طریقے، ہوائی جہاز وغیرہ تیار کرنے کے راز نہیں ملیں گے، کسی ماہر ہیئت کو اس میں سیاروں کی چالوں اور رفتاروں کی جداول نہیں ملیں گی، کسی مؤرخ کو اس میں پانی پت کی لڑائیوں کی تفصیل نہیں ملے گی، کسی کھلاڑی کو اس میں کرکٹ وغیرہ کے لئے قواعد وضوابط نہیں ملیں گے وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگوں کا سراسر جہالت اور نادان دوستی پر مبنی یہ مضحکہ خیز دعویٰ باطل اور مردود ہے کہ اہل مغرب کی ایجادات قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ قرآن کریم ان مقاصد کے لئے نازل نہیں ہوا، اگر ایسا ہوتا تو جوہری بم وغیرہ خود رسول اللہ ﷺ ایجاد فرماتے اور آپ کے بعد آپ کے خلفا بھی دور حاضر کی تمام ایجادات تیار کر چکے ہوتے۔

قرآن کریم میں مظاہر فطرت کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ حیوانات، نباتات، جمادات، ہوا اور پانی وغیرہ کے متعلق بعض اہم حقائق بھی مذکور ہیں لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں بل کہ ان سے اہم دینی اصول وفروع کا اثبات مقصود ہے۔ یہ مشاہداتی اور تکوینی دلائل ہیں۔ ان سے قرآن کریم کا معجزہ ہونا بھی یقیناً ثابت ہوتا ہے۔ البتہ سائنسی علوم کے ماہرین جن قوانین فطرت یعنی تکوینی قوانین کو معلوم کرتے ہیں، بعض اوقات ان کا صحیح صحیح دریافت کر لینا یقینی اور قطعی نہیں بل کہ ظنی ہوا کرتا ہے۔ تاہم جو باتیں یقیناً صحیح ہوں قرآن کریم ہرگز ان کا مخالف ومعارض نہیں ہوسکتا، کیوں کہ سچ کا سچ سے کوئی تعارض یا ٹکراؤ نہیں ہوا کرتا۔ ہاں اگر تجربات ومشاہدات سے حاصل کردہ نتائج ظنی ہوں تو تکلف کر کے اُنہیں قرآن پر چسپاں کرنا بہت بڑی حماقت بھی ہے اور جسارت بھی۔ مثلاً کسی زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ قوانین فطرت میں کوئی تبدیلی ممکن ہی نہیں اور یہ کہ قوانین فطرت اندھے، بہرے اور بے مقصد ہیں۔ اسے مادیت کا میکانکی نظریہ کہا جاتا تھا، چناں چہ کچھ لوگ مثلاً سرسیّد احمد خان اور ان کے ساتھی معجزات وغیرہ کے اس لئے منکر ہوگئے کہ ان کے خیال میں یہ معجزات قوانین فطرت کے خلاف تھے اور ان

کا یہ بھی خیال تھا کہ اُنہوں نے بڑی حد تک ان قوانین فطرت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا ہے لہٰذا یہ قوانین ان کی فہم وفراست کے تابع مہمل ہو کر رہ گئے ہیں۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے جن معجزات کا ذکر ہے، ان کی عجیب عجیب بے ہودہ اور مضحکہ خیز تاویلات کی گئیں۔ اب میکانکی مادیت کا نظریہ متروک ہو چکا ہے۔ سائنس دان کائنات میں مقصدیت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ بعض تکوینی حقائق اور قرآن کریم سے ان کی توثیق کی مثالیں یہ ہیں:

۱۔ ابتدائے تخلیق میں مادہ گیس کی حالت میں تھا سائنس کی اس دریافت کا اس قرآنی آیت سے موازنہ کیجئے۔ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۱۳/ الف) ''پھر وہ (اللہ) آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت وہ (آسمان) دھوئیں کی حالت میں تھا۔''

۲۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۱۳/ ج) ''ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔''

۳۔ جدید تحقیق کے مطابق اجرام سماوی اپنے اپنے مداروں میں حرکت کر رہے ہیں۔ ان کی حرکت نہایت متوازن اور پیچیدہ حسابی قواعد پر مبنی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ ''سورج کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور یہ تمام (اجرام سماوی) آسمانی فضا میں تیر رہے ہیں۔'' (۱۴/ الف) نیز ارشاد ہے کہ ''سورج اور چاند ایک حساب سے (چل رہے) ہیں'' (۱۴/ ب)

۴۔ جدید تحقیق کے مطابق یہ کائنات پھیل رہی ہے۔ قرآن کریم میں ہے ''وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۱۴/ ج) ''آسمان کو ہم نے ہاتھوں سے بنایا اور ہم وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔''

۵۔ جدید تحقیق کے مطابق زمین کے بیرونی سخت حصے کے نیچے ایک نرم طبقے کے اندر پہاڑ داخل ہو کر جڑوں کا کام کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ مضمون ہے کہ ہم نے پہاڑوں کو میخیں بنایا ہے۔

۶۔ جدید ترین تحقیق کے مطابق ایٹم یا جوہر ایک طرح کی برقی توانائی ہے۔ اس کے پھٹنے سے بے پناہ توانائی اور تیز روشنی کا اخراج ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۵/ الف) ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور یعنی منور بہ معنی روشن کرنے والا ہے۔''

بہت سے ایسے تکوینی حقائق آج سے سیکڑوں برس خصوصاً نزول قرآن کے زمانے میں لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ اُمی تھے۔ آپ وحی کے بغیر یہ حقائق از خود بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح واقعاتی شواہد کا سمجھنا عام لوگوں کے لئے حتیٰ کہ ناخواندہ اور کند ذہن لوگوں کے لئے بھی چوں کہ نسبتاً

آسان ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم میں ماضی حال اور مستقبل کے متعلق خبریں خاصی تعداد میں دی گئی ہیں، لیکن قرآن کریم میں جو کچھ بھی ہے، لوگوں کی دینی ضرورت کے مطابق ہے اس سے کم وبیش نہیں۔ لہٰذا قرآن میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد ان چیزوں کی تفصیل ہے جو لوگوں کی دینی رہنمائی کے لئے ضروری ہیں۔ تورات کے تفصیل لکل شیء ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے حضرت موسیٰ عالم جمیع ما کان وما یکون، حاضر وناظر اور مختار کل ہوگئے تھے۔ اسی طرح قرآن کریم کے تفصیل لکل شیء اور تبیان لکل شیء کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ مکمل نزول قرآن کے بعد رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرامؓ کو غیب کلی کا علم حاصل ہوگیا تھا۔

خوب غور کیجئے تورات حضرت موسیٰ کو پوری کی پوری کوہِ طور پر مل چکی تھی۔ اگر اس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہونے سے حضرت موسیٰ عالم الغیب اور حاضر وناظر ہوگئے تھے تو حضرت موسیٰ کو اپنی قوم کی گم راہی اور گوسالہ پرستی کا اور اس سلسلے میں قوم کی نگرانی پر مامور حضرت ہارون کے سراسر بے قصور ہونے کا، قوم کو گم راہ کرنے میں سامری کے کردار کا پورا علم ہوتا، بچھڑا تیار کرنے اور اس کی پوجا کے تمام حالات سے آپ پوری طرح باخبر ہوتے اور یہ تمام مناظر آپ سے مخفی نہ رہتے۔ کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو قوم کے گم راہ ہونے کی اطلاع دی تو آپؑ سخت رنج اور غصے کی حالت میں قوم کے پاس پہنچے۔ تورات کی تختیاں ایک طرف رکھ دیں اور اپنے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ کو سخت غصے کے عالم میں داڑھی سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ حضرت ہارون نے اُنہیں یقین دلایا کہ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ یہ قوم تو مجھے قتل کرنے کے درپے تھی اس لئے آپ مجھے لوگوں کے سامنے یوں شرمندہ نہ کریں اور مجھے تو یہ بھی خدشہ ہے کہ آپ (غلط فہمی کی بناء پر) شاید یہاں تک کہہ بیٹھیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفریق پیدا کر دی ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ کا غصہ فرو ہوا۔ اپنے لئے بھی اور اپنے بھائی کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا پھر آپ نے سامری کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ (۱۵/ب)

یہ تمام امور بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ پوری تورات مل جانے کے باوجود بھی حضرت موسیٰ ہرگز ہرگز عالم جمیع ما کان وما یکون نہیں ہوگئے تھے حال آں کہ تورات میں بھی ہر چیز کی تفصیل موجود تھی۔ پس یہاں ہر چیز سے مراد اصولی وضروری دینی مسائل ہیں جو تورات میں مذکور تھے۔

یہاں دل چسپ بات یہ ہے کہ تورات کے برعکس قرآن کریم کا نزول تو بتدریج کوئی ۲۳ سال تک ہوتا رہا اور قرآن کریم میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہونے کی آیت سورۂ یوسف کی، قرآن کریم میں ہر چیز کا بیان ہونے کی آیت سورۂ نحل کی، اور مَافَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ والی آیت سورۂ انعام کی ہے۔ یہ

تینوں مکی سورتیں ہیں اگر ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ عالم جمیع ما کان و ما یکون ہو گئے تھے تو ان کے بعد باقی ماندہ قرآن کی ایک بھی آیت کے آپ ﷺ پر نزول کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی، لیکن ان متعلقہ آیات کے بعد بھی سال ہا سال تک قرآن کریم کا نزول ہوتا رہا۔ نیز سورۂ انعام کی مذکورہ آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک ''کتاب'' سے مراد قرآن کریم نہیں بل کہ لوح محفوظ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ پورا قرآن اُترنے کے بعد آپ عالم الغیب ہو جائیں گے تو یہ پہلی سے بھی زیادہ دل چسپ بات ہے کہ غیب کلی کا علم دیئے جانے کی (مفروضہ) دلیل تو کئی سال پہلے نازل ہو جائے اور مدلول یعنی غیب کلی کا دیا جانا کئی سالوں کے بعد جا کر ظاہر ہو۔ معاملہ عقائد کا ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو قرآن کریم میں صاف صاف اور کھلے الفاظ میں یہ مضمون ایک دو مرتبہ نہیں بل کہ بار بار مذکور ہونا چاہئے تھا کہ ہمارا یہ پیغمبر ۲۳ سال تک تو غیب کلی کے پورے علم کے بغیر ہی رہے گا اور جوں ہی قرآن کا نزول مکمل ہوگا اور ہمارے پیغمبر کی دنیوی زندگی کے تقریباً تین ماہ باقی رہ جائیں گے تو آپ کو غیب کلی کے علم سے مالا مال کر دیا جائے گا۔ یہاں یاد رہے کہ مخلوق کے لئے غیب کلی کا علم سرے سے کمال ہے ہی نہیں بل کہ عیب ہے جیسا کہ ہم آئندہ مباحث میں واضح کر رہے ہیں۔

آخر میں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق کے متعلق صحیح تعلیم وحی ربانی کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے پیغمبر کی وحی جلی اور وحی خفی کا اصل موضوع یہی مذکورہ امور ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ان امور کی صحیح معرفت قوانین شریعت سے ہوتی ہے۔ عقلی وطبیعی (سائنسی) علوم کا تعلق قوانین فطرت اور عقل، تجربے ومشاہدے کے ذریعے ان قوانین فطرت کی صحیح معرفت سے ہوتا ہے، ان کے لئے اصطلاحی وحی کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن شریعت میں ان عقلی وطبیعی علوم کی افادیت واہمیت کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ قوموں کی معاشی، معاشرتی، سیاسی وعسکری ترقی اور دوسری قوموں سے جائز مسابقت ان دنیوی علوم کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ علوم ''فی الدین'' (دین کے اندر) داخل نہیں لیکن ''للدین'' (دین کے لئے مفید وناگزیر) تو یقیناً ہیں۔ ضروری کا مقدمہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ چناں چہ مثلاً سورۂ انفال میں ہے کہ ''تم جہاں تک ہو سکے (اپنے) ان (دشمنوں) کے خلاف قوت کی اور گھوڑوں کو مستعد رکھنے کی تیاری کرو جس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور اوروں کو بھی جنہیں تم (ابھی) نہیں جانتے (مگر) اللہ اُنہیں خوب جانتا ہے، (اس مقصد کے لئے) تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' (۱۵/ ج) اس قرآنی مضمون میں ''قوت'' کو عام رکھا گیا ہے کہ ہر دور کے تقاضوں اور علمی ارتقاء کے مطابق دشمنوں سے اپنی

حفاظت کے لئے اپنی قوت وطاقت کو تیار رکھو۔ صرف موجودہ حقیقی دشمنوں کے خلاف ہی نہیں بل کہ مستقبل کے ممکنہ دشمنوں کے خلاف بھی تیار اور مستعد رہو اور مثلاً سورۂ یونس میں ہے کہ ''اسی (اللہ) نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کے لئے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلیا کرو، اللہ نے یہ چیزیں بے فائدہ پیدا نہیں کیں، وہ یہ دلائل ان لوگوں کو صاف صاف بتلا رہا ہے جو سمجھ رکھتے ہیں۔'' (۱۶/ الف) رسول اکرم ﷺ نے وحی جلی وخفی کے ذریعے بعض ایسی اطلاعات بہ طور معجزہ دی ہیں جن کا علم عقلی وطبیعی علوم کے ماہرین کو سیکڑوں برس بعد ہوسکا ہے۔ مثلاً آب زم زم، شہد اور کلونجی کی شفا بخش تاثیرات آپ نے بیان فرمائیں تاکہ بعد کے ماہرین اپنی طویل اور پیچیدہ تحقیقات سے جو نتائج برآمد کریں، ان سے رسول اللہ ﷺ کا سچا ہونا ثابت ہوجائے ورنہ یہ چیزیں شریعت کا اصل موضوع نہیں ہیں۔ سورہ حم السجدہ میں ہے کہ ہم عن قریب ان لوگوں کو آفاق (اطراف واکناف) میں اور خود ان کی جانوں میں اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں گے جن سے ان پر یہ (مزید) اچھی طرح واضح ہوجائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔ (۱۶/ ب) ملاحدہ کا مثلاً یہ اعتراض تھا کہ لوح محفوظ میں ہر شے کا تفصیلی بیان کیسے ہوسکتا ہے کیوں کہ یہ خارجی موجودات اور ان کے احوال وکیفیات تو لامتناہی ہیں لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ موبائل کی چھوٹی سی (Sim) میں انسان معلومات کا خاصا بڑا ذخیرہ جمع کرسکتا ہے۔ ملاحدہ کا اعتراض تھا کہ قیامت کے دن انسانی اعمال کا وزن کیسے ہوسکتا ہے لیکن جب انسان نے خداداد علم سے جسمانی حرارت موسمی درجہ حرارت وغیرہ کی پیمائش کے آلات تیار کرلئے تو ملاحدہ کے اس طرح کے اعتراضات میں قطعاً کوئی وزن ہی نہیں رہا۔ اگر آج انسان آوازوں کو محفوظ کرلینے کے طریقے جانتا ہے تو قیامت تک کے لوگوں کے اعمال اور ان کی حرکات وسکنات کو محفوظ کرلینا قادر مطلق اللہ تعالیٰ کے لئے کیسے مشکل ہوسکتا ہے؟

الغرض مفید اور ناگزیر دنیوی علوم بھی اپنی جگہ پر نہایت اہم ہیں بہ شرطے کہ محض ظنی معلومات کی بنا پر یا کج فہمی سے قوانین فطرت کو قوانین شریعت سے متصادم نہ سمجھ لیا جائے اور قرآن کریم کی محکم آیات میں دور از کار اور فاسد تاویلات نہ کی جائیں، قرآن کریم کے متعلق افراط وتفریط سے کام نہ لیا جائے۔ بلاشبہ قرآن کریم کے مختصر کلمات میں معانی کا ایک سمندر پنہاں ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ اس میں ہر غیر متعلقہ چیز بھی داخل ہے۔

۳۔ بہ حوالہ کمال وعدم کمال

الف: دنیوی زندگی میں حضرات انبیاء علیہم السلام مختلف آزمائشوں سے دوچار ہوتے ہوں گے یا

نہیں۔ اگر نہیں تو وہ لوگوں کے لئے (معاذ اللہ) مکمل نمونہ نہیں بن سکتے، چناں چہ پہلی شق ہی درست ہے اور قرآن کریم سے بھی اسی کی تائید وتوثیق ہو رہی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل کو میری خاطر ذبح کردو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا ہے ان هذا لهو البلاء المبين (۱۶/ ج) ''بے شک یہ ایک بہت کھلی آزمائش تھی۔'' اب دیکھئے اگر حضرت ابراہیمؑ کو پہلے سے غیب کا علم حاصل ہوتا تو آزمائش ہی سرے سے بے معنیٰ ٹھہرتی۔ اگر انہیں پہلے سے علم ہوتا کہ میرا بیٹا ہرگز ذبح نہیں ہوگا بل کہ ایک پلا پلایا دنبہ ہاتھ لگے گا تو ایسی نام نہاد آزمائش کو پورا کرنے کے لئے تو عام لوگوں میں بھی دو زلگ جائے گی۔ مخلوق کا کام اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ غیب کلی کے علم سے بندگی کا اعلیٰ مرتبہ خلل پذیر ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ زید غیب جانتا ہے اور عمرو نہیں جانتا۔ عمرو کا بیٹا اتفاقاً بیمار پڑ گیا، وہ کئی دنوں تک متعدد معالجوں اور طبیبوں سے بچے کا علاج کرواتا رہا اور بچے کے علاج پر اس کے بھاری مصارف اُٹھ گئے۔ لیکن اس کے باوجود مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ عمرو چوں کہ غیب نہیں جانتا اس لئے اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ بچے کا یہ مرض مہلک ثابت ہوگا یا بچہ بالآخر شفایاب ہو جائے گا۔ وہ روزانہ ہر نماز کے بعد اور باقی اوقات میں بھی اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہا اور بچے کے لئے گڑگڑا کر دعا مانگتا رہا۔ دعا عبادت کا مغز ہے۔ ایک روز اس کے ایک دوست نے اسے ایک گھریلو نسخہ بتایا جس پر بالکل معمولی سی رقم نہ ہونے کے برابر خرچ ہوئی۔ اسی دوا سے بچہ شفایاب ہوگیا۔ عمرو کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پہلے وہ صبر سے کام لے رہا تھا اب اس نے خلوصِ قلب سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ادھر زید کا بیٹا بھی بعینہٖ اسی وبائی بیماری میں مبتلا ہوا۔ زید چوں کہ غیب کلی کا علم رکھتا تھا اس لیے اسے قطعاً یہ ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ مختلف معالجین اور اطبا کے پاس جا کر دھکے کھائے اور رقم بھی بلاوجہ برباد کرتا پھرے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا بچہ اس مرض میں مرے گا نہیں اس لئے وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوا اور اس نے نہایت سکون واطمینان سے پہلے ہی دن وہی گھریلو نسخہ بچے کو استعمال کرا دیا اور بچہ بالکل صحت مند ہوگیا۔ اب خوب غور کیجئے کہ پریشانی عمرو کو ہوئی، رقم بھی اس کی کہیں زیادہ خرچ ہوئی، اس پریشانی پر اس نے صبر کیا۔ دعائیں بھی نہایت عاجزی سے وہی کثرت سے مانگتا رہا اور بچے کے شفایاب ہونے پر جس جذباتی کیفیت میں اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اس کیفیت کا عشر عشیر بھی زید کو حاصل نہ ہوا۔ اب اللہ تعالیٰ بلاوجہ اجر زید کو زیادہ دے اور عمرو بے چارے کو محروم کردے یا زید کی نسبت کم اجر دے تو کون عقل مند اسے تسلیم کرے گا؟ بے شک اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں لیکن وہ کسی کا اجر بلاوجہ ضائع نہیں کرتا۔ چوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا درجہ بہت بہت بلند ہوتا ہے اس لئے اُنہیں عام لوگوں کی نسبت زیادہ

آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر انہیں غیب کلی کا علم دے دیا جائے تو وہ اس غیب کلی کے علم کی بنا پر مصیبت سے نجات کے تمام اسباب پہلے ہی سے جمع کر لیں گے خصوصاً جب کہ انہیں مختارِ کل بھی قرار دیا جائے تو ہر سبب ان کے اختیار میں ہوگا اور ہر سبب سے فائدہ اُٹھانا اُن کے بس میں ہوگا۔ پس ان کے لئے کوئی آزمائش دراصل آزمائش ہی نہیں رہے گی اور وہ لوگوں کے لئے نمونہ عمل بھی نہیں بن سکیں گے۔ ایسا علم تو ان کے لئے عیب بن جائے گا نہ کہ اسے کوئی کمال قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تکبر اللہ تعالیٰ کے لئے کمال ہے اور وہی متکبر ہے، مخلوق کے لئے تکبر سخت عیب ہے اور مخلوق میں جو متکبر بننے کی کوشش کرے گا اور اسی پر ڈٹا رہے گا تو بالآخر جہنم رسید ہوگا۔ بعینہٖ اسی طرح غیب کلی کا علم اللہ تعالیٰ کے لئے کمال ہے اور کوئی کمال ایسا نہیں جو اسے حاصل نہ ہو لیکن مخلوق کے لئے غیب کلی کا علم کمال نہیں بل کہ سخت عیب ہوگا جس سے اس کا مرتبہ عبدیت بری طرح خلل پذیر ہوگا اور کوئی آزمائش اس کے لئے آزمائش نہیں رہے گی۔ اسی حقیقت کا رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے یوں برملا اعلان کرایا ہے قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعاً وَّلَاضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ O (۱۶/د) ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میں تو اپنی جان کے نفع ونقصان کا بھی مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی (دنیوی) بھلائیاں (پہلے سے ہی) جمع کر لیا کرتا اور مجھے کوئی (دنیوی) تکلیف نہ پہنچا کرتی، میں تو (نہ ماننے والوں کو) صرف ڈرانے والا اور مومنوں کو خوشخبری سنانے والا ہوں''۔ دیکھئے یہاں یہ نہیں کہا گیا ''لجمعت الخیر'' کہ میں سب کی سب بھلائیاں اکٹھی کر لیا کرتا کیوں کہ غیر اختیاری بھلائیاں ان کے پیشگی علم کے باوجود حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں اختیاری بھلائیوں اور اختیاری فوائد کی بات ہو رہی ہے کہ اگر مجھے غیب کلی کا علم دیا گیا ہوتا تو مستقبل کی بہت سی (دنیوی) بھلائیوں کو حاصل کرنے اور بہت سے (دنیوی) نقصانات سے بچنے میں کوئی امر مانع نہ ہوتا اور اگر میں مختار کل ہوتا تو بہت سی نہیں بل کہ سب کی سب بھلائیوں کو جمع کر لینے پر مجھے پوری قدرت ہوتی اور میں یہ نہ کہتا اور مجھ سے یہ اعلان نہ کروایا جاتا کہ اللہ کی مشیت کے بغیر میں اپنی جان کے بھی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ یہاں ذاتی اور عطائی کی بحث بھی فضول ہے، کیوں کہ غیب کلی کا علم اور اختیارِ کلی جس کو بھی عطا کر دیا جائے تو یہ عطائی علم ہی دنیوی بھلائیوں کے جمع کر لینے اور دنیوی نقصانات سے بچ نکلنے کے لئے کافی اور وافی ہوگا۔ مثلاً آپ غیب جانتے ہوتے تو طائف تشریف نہ لے جاتے اور وہاں تکلیف نہ اُٹھاتے، کیوں کہ طائف کے لوگوں نے فتح مکہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق اسلام قبول کر ہی لینا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی علم ہوتا تو

آپ فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے بعد کے وقت کا انتظار فرماتے۔ غزوۂ احد میں سب لوگوں نے میدان جنگ نہیں چھوڑا تھا۔ آپ ﷺ کو بعد کے حالات کا پیشگی علم دیا جاتا تو آپ درّے پر ان تیراندازوں کو مقرر فرماتے جو کسی بھی حالت میں درّہ نہ چھوڑتے، یوں اس غزوے میں ستر مسلمان شہید نہ ہوتے اور نہ ہی آپ خود زخمی ہوتے۔ کسی تکلیف کا پیشگی علم حاصل ہو جائے اور اس سے بچنے کا اللہ تعالیٰ نے پورا اختیار دے رکھا ہو اور اس سے بچ نکلنے کے اسباب بھی اپنی رسائی میں ہوں پھر بھی اس اختیار کو استعمال نہ کرنا اور اسباب سے فائدہ نہ اُٹھانا ہرگز ہرگز صبر نہیں بل کہ بدترین مصیبت اور گناہ ہے۔ سورۂ اعراف کی مذکورہ آیت میں ''خیر'' سے دنیوی بھلائیاں اور ''سوء'' سے دنیوی نقصان مراد ہے۔ اخروی زندگی میں تو حضرات انبیاء علیہم السلام اور نیک لوگ ہر برائی اور نقصان سے یقیناً محفوظ ہوں گے اور وہاں ان کے لئے بھلائیاں ہی بھلائیاں ہوں گی اس لئے آیت کے معنی و مفہوم میں کسی فاسد تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ پس غیب کلی کے جس (مفروضہ) علم سے حضرات انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظیم کا مرتبۂ عبدیت خلل پذیر ہو، اسے ان کی طرف منسوب کرنا حکمت نہیں بل کہ سفاہت وحماقت ہے۔ اس سے ان حضرات کا مرتبہ بلند نہیں ہوتا بل کہ ان کی توہین لازم آتی ہے، جیسے ان حضرات کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) متکبر قرار دینے سے ان کی توہین ہوتی ہے، بعینہٖ اسی طرح اُنہیں عالم جمیع ما کان و ما یکون اور مختار کل قرار دینے سے ان کی توہین ہوتی ہے۔ تکبر کی طرح غیب کلی کا علم بھی اللہ تعالیٰ کا خاصہ اور اسی کے شایان شان ہے۔ مخلوق کے لئے یہ اوصاف دراصل اوصافِ عیب ہیں، اوصافِ کمال نہیں۔ فتدبر وتشکر

ب: حضرات انبیاء علیہم السلام کو غیب کلی کا علم دیا گیا ہو تو اُنہیں سب لوگوں کے دلوں کی مخفی حالتوں اور باتوں کا علم ہوگا یا نہیں۔ اگر نہیں تو وہ عالم الغیب نہ ہوئے۔ اگر ہوگا تو لاتعداد ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی قلبی کیفیت کا علم حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے فرحت بخش نہیں بل کہ نہایت تکلیف دہ ہوگا۔ اسی طرح اپنے اعزہ واقارب کی دنیوی آزمائشوں کا خصوصاً اور عام اہل ایمان پر گزرنے والے مصائب کا عموماً تفصیلی وچشم دید علم ومنظر بھی ان انبیاء علیہم السلام کے لئے انتہائی ناخوش گوار ہوگا۔ شیرینی میں کڑواہٹ ملا دی جائے تو غلبہ کڑواہٹ کو ہوگا۔ یوں حضرات انبیاء علیہم السلام کا دوسروں کے متعلق بہ یک وقت خوش گوار اور ناخوش گوار علم دراصل ناخوش گوار ہی ٹھہرے گا جو ان کے لئے باعث اذیت ہوگا۔ ایسے علم کو ان کی طرف منسوب کرنا حکمت ودانش نہیں بل کہ سفاہت وحماقت ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی مثال دینا غلط ہوگا کیوں کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور مخلوق کے عوارض سے بالاتر ہے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام مخلوق ہونے کی بنا پر مخلوق کے عوارض سے بالاتر نہیں ہیں، ورنہ وہ لوگوں کے لئے نمونہ عمل نہیں بن سکتے۔

پس غیب کلی کا علم اگر حضرات انبیاء علیہم السلام کو دے دیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ ان کے لئے یہ کمال کی بہ جائے عیب بن جاتا، جیسا کہ اوپر حصہ ''الف'' میں واضح ہو چکا ہے، بل کہ مفید ہونے کی بہ جائے اُلٹا ان کے لئے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) وبالِ جان بھی ثابت ہوتا۔ تو جس طرح تکبر اللہ ہی کے شایانِ شان ہے۔ اسی طرح غیب کلی کا علم بھی اسی کو زیبا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۱۷/الف) ''بھلا وہ بھی نہ جانے گا جس نے (کائنات کو) پیدا فرمایا ہے حال آں کہ وہ تو نہایت ہی باریک بین اور (پوری طرح) باخبر ہے۔'' یعنی جو خالق ہے اسی کو ذرہ ذرہ سے باخبر ہونا چاہئے۔ اگر وہ مخلوق کے حالات سے باخبر نہ ہو تو وہ ان کی نگرانی، پرورش اور ان کی ضروریات کو کیسے پورا کرے گا؟ وہ رحمٰن ورحیم ہے تو جن پر اس نے رحمت کرنی ہے ان سے وہ لازماً باخبر بھی ہوگا۔ وہ قہار و جبار بھی ہے تو جن کا اس نے مواخذہ ومحاسبہ کرنا ہے ان سے اور ان کے اعمال سے وہ پوری طرح باخبر ہوگا۔ یہ صفت مخلوق کی نہیں چناں چہ پورے قرآن میں اس طرح کا مضمون ہرگز نہیں ملے گا کہ ''بھلا جسے پیدا کیا گیا ہو وہ باریک بین اور باخبر نہ ہوگا؟'' اللہ تعالیٰ ہی حقیقی رحمٰن ورحیم ہے۔ اسی نے مثلاً ماں باپ کو اولاد پر مہربان بنایا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ والدین کو اپنی اولاد کے ہر ہر حال کا ہمہ وقت تفصیلی علم بھی حاصل ہو۔ ان کو تو خود اپنے متعلق ہر طرح کا تفصیلی علم حاصل نہیں کہ مثلاً دن میں نبض کتنی مرتبہ دھڑکی ہے، کتنی مرتبہ سانس لیا ہے، دن بھر میں جتنا پانی پیا ہے اس کے ٹھیک ٹھیک کتنے قطرے معدے اور پیٹ میں گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ہی رسول اکرم ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے۔ اگر یہاں ''رحمت'' کو ''رحیم'' (مہربان) کے معنی میں لیا جائے تو بھی اس سے آپ کا عالم الغیب اور مختار کل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اصل رحمٰن و رحیم تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے جس طرح والدین کو اپنی اولاد کے لئے، اچھے استاد کو اپنے شاگردوں کے لئے، اچھے حاکم کو رعایا کے لئے ایک اچھے مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لئے رحمت بنایا ہے اسی طرح اس نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت یعنی تمام اقوام عالم کے لئے رحمت بنایا ہے۔ یہ رحمت کے ذرائع ہیں۔ درمیانی ذرائع اور اسباب میں خالق کی صفات نہیں بل کہ مخلوق کی صفات ہوا کرتی ہیں اور مخلوق کا ہر چیز سے تفصیلی طور پر باخبر ہونا ہرگز ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ والدین اپنی اولاد پر، مشفق استاد اپنے شاگرد پر، اچھا حاکم اپنی رعایا پر، ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر رحیم (مہربان) تو ہوسکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جن پر وہ مہربانی کر رہا ہے ان کے تفصیلی حالات سے بھی پوری طرح ہر جگہ اور ہر وقت باخبر ہو کیوں کہ اصل رحیم تو اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ درمیانی اسباب تو اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ایک عالم دین کی خدمات سے بے شمار لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر

یہ ضروری نہیں کہ فائدہ اُٹھانے والے ان لوگوں کا فرداً فرداً اور تفصیلی علم بھی اس عالم کو حاصل ہو۔ حقیقت میں فائدہ تو اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے وہ جس طرح چاہے اور جسے چاہے اور جس کے ذریعے جتنا چاہے اور جب چاہے فائدہ پہنچائے۔ اس سے ان درمیانی ذرائع کا عالم الغیب ہونا یا مختار کل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح حقیقی مولیٰ اور آقا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ ''پھر سب لوگوں کو ان کے حقیقی مولیٰ (اللہ تعالیٰ) کے پاس لوٹایا جائے گا۔ خوب سن لو فیصلہ اسی (حقیقی مالک) کا ہی ہوگا اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔'' (۱۷/ب) اور مثلاً سورہ حج میں ہے کہ ''اللہ کو مضبوط تھام لو وہی تمہارا مولیٰ (مالک) ہے پس کیا ہی اچھا مالک ہے اور کتنا ہی بہترین مددگار ہے!'' (۱۷/ج) غزوۂ احد میں قریش مکہ کے سردار ابوسفیانؓ نے بہ حالت کفر یہ نعرہ لگایا تھا ''عزیٰ لنا ولا عزیٰ لکم'' کہ عزیٰ (بت) ہمارا ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے یہ نعرہ لگوایا تھا **اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم** کہ اللہ ہمارا مولیٰ (آقا) ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ کوئی لفظ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو اس کا معنی و مفہوم وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہو اور جب وہی لفظ لسانی محاورات میں کسی مخلوق کے لئے بولا جائے تو معنی و مفہوم اس مخلوق کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ تمام کائنات کا حقیقی مولیٰ اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے وہ یقیناً اپنی مخلوق کے ذرہ ذرہ سے باخبر ہے۔ مخلوق کی یہ صفت نہیں۔ ہم اپنے دینی علماء کو ''مولانا'' (ہمارے آقا) کہہ کر پکارتے ہیں لیکن ہرگز ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ یہ مولانا حضرات عالم الغیب، حاضر و ناظر اور مختار کل ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی مولیٰ کا کلمہ یہ معنی نہیں رکھتا۔ سورۂ یوسف میں عزیز مصر کو اپنی بیوی کا سیّد (سردار و آقا) کہا گیا ہے اور سورۂ آل عمران میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی سیّد کہا گیا ہے۔ (۱۸/الف) تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی سیّد کا لفظ بہ طریق اولیٰ استعمال ہوسکتا ہے لیکن یہاں بھی یہ خوب سمجھ لیجئے کہ حقیقی سیّد یعنی آقا اور سردار بھی اللہ تعالیٰ ہے گو عرف عام میں سیّد کا لفظ اللہ تعالیٰ کی بہ جائے مخلوق پر بولا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بھی مخلوق حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی مولیٰ اور سیّد کے کلمات اس معنی میں استعمال کرے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بہ زعم خویش آپ کے لئے ثابت کرے تو شرعاً ہرگز اس کی اجازت نہیں ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے بہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **لایقولن احدکم عبدی وامتی کلکم عبیداللہ وکل نسائکم اماء اللہ ولا یقل العبدلسیّدہ مولای فان مولاکم اللہ** (۱۸/الف) ''تم میں سے کوئی عبدی و امتی (میرا بندہ اور میری بندی) نہ کہے تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں اور غلام اپنے سردار کو مولای (میرا آقا) نہ کہے کیوں کہ تم سب کا آقا اللہ ہے۔'' دیکھئے

جہاں آپ نے شرک کا خطرہ محسوس فرمایا تو مخلوق پر مولیٰ (آقا اور مالک) کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرمادیا بل کہ جہاں آپ نے محسوس فرمایا کہ ''سیّد'' کے لفظ کو مخلوق پر استعمال کرنے سے شرک کا خطرہ ہے تو آپ نے اس سے بھی روک دیا۔ حضرت مطرف بن عبداللہ بن الشخیر سے روایت ہے کہ میرے باپ نے بتایا کہ میں بنی عامر کے اس وفد میں شامل تھا جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ہم نے آپ ﷺ سے کہا۔ ''انت سیّدنا'' کہ آپ ہمارے سیّد (سردار) ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ''السیّد اللہ'' سردار اللہ ہے۔ ہم نے کہا کہ آپ ہم سب سے افضل اور بڑے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں یہ ساری یا بعض بات کہہ سکتے ہو۔ فلا یستجرینکم الشیطن لیکن شیطان تمہیں جری اور گستاخ نہ بنا دے۔ (۱۸/ب) حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''مجھے حد سے نہ بڑھاؤ میں تو محض عبداللہ (اللہ کا بندہ) ہوں سو تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔'' (۱۸/ج) یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں آپ کے لئے کہیں بھی اللہ کا حبیب، اللہ کا محبوب، اللہ کا خلیل جیسے کلمات نہیں لائے گئے بل کہ آپ کو اللہ کا عبد (بندہ) کہا گیا ہے حال آں کہ آپ بلاشبہ اللہ کے خلیل، اس کی محبوب ترین ہستی اور بعد از خدا بزرگ توئی کے مصداق ہیں۔ نماز افضل ترین عبادت ہے اور اس میں افضل ترین درود یعنی درود ابراہیمی شامل ہے لیکن اس میں بھی آپ کے اور حضرت ابراہیمؑ کے اسمائے گرامی سے پہلے سیّدنا اور مولانا جیسے کلمات نہیں لائے گئے کیوں کہ شیطان کے بہکانے سے لوگ بات بات پر شرک کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ کلمہ شہادت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ (اس کا بندہ اور اس کا رسول) کے کلمات ہیں حَبِیْبُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ (اس کا محبوب اور اس کا رسول) جیسے کلمات نہیں لائے گئے ہیں پس جس عقیدے سے حضرات انبیاء علیہم السلام کا مرتبۂ عبدیت خلل پذیر ہو اس سے پیغمبروں کی تعظیم و تکریم نہیں بل کہ توہین ہوتی ہے۔ مخلوق کا کمال عبدیت (بندہ ہونے) میں اور خالق کا کمال الوہیت (معبود ہونے) میں ہے۔ چناں چہ لفظ مولیٰ کا استعمال اللہ تعالیٰ پر اس کی بلند ترین شان اور عظمت کے مطابق ہے اور مخلوق پر اس کا استعمال مخلوق کے اپنے مرتبے اور اپنی شان کے مطابق ہے۔ مخلوق کو عالم الغیب، حاضر و ناظر اور مختار کل کے معنی میں مولیٰ اور سیّد کہنا قطعاً ممنوع ہے اور یہ ممانعت خود رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی کی زبان مبارک سے ہے۔ یہ صرف اور صرف خالق کی شان اور صفت ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے ذرہ ذرہ سے باخبر ہے۔ مخلوق کے لئے یہ صفت نہ صرف یہ کہ کوئی کمال نہیں بل کہ اُلٹا وبالِ جان ہے جیسا کہ ہم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ صفت مخلوق کو عطا نہیں کی گئی۔ یہ صفت الوہیت کا لازمہ ہے نہ کہ عبدیت کا۔

۴۔ بہ حوالہ علوم متعلقہ وغیر متعلقہ

الف: کیا مخلوق کو اس کے منصب اور کام سے سراسر غیر متعلق علوم حاصل نہ ہوں تو اس لاعلمی سے اس کا مقام و مرتبہ خلل پذیر ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو بے شک عقل سلیم کا بدیہی فیصلہ یہی ہے۔ مثلاً کسی ملک کا صدر یا وزیر اعظم طبی علوم سے ناآشنا ہو، وہ مثلاً ماہر زرگر کی طرح سونے اور چاندی کے زیورات نہ بنا سکتا ہو اور مثلاً کسی جامعہ کا مدیر اور شیخ (وائس چانسلر) کپڑا بننے کے فن سے بالکل ناآشنا ہو تو اس سے ان کے منصب اور کام میں قطعاً کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کا مقام و مرتبہ کسی طرح مجروح ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام حتیٰ کہ سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ کو ان کے منصب سے تعلق نہ رکھنے والے علوم نہ دیئے جائیں تو اس سے ہرگز ان کی توہین نہیں ہوتی۔ سورۂ یٰس میں ہے کہ ہم نے اس پیغمبر کو شعر نہیں سکھائے اور نہ ہی (شاعری) اس کے لائق ہے (اس پر نازل ہونے والی) یہ (کتاب) تو صرف نصیحت اور واضح قرآن ہے۔ (۱۹/ الف) شعر گوئی اگر برے اشعار پر مشتمل ہو تو مذموم ہے۔ اگر اشعار میں اچھی تعلیم ہو، اشعار پُر حکمت ہوں تو ایسی شاعری مذموم نہیں بل کہ پسندیدہ ہے۔ اُمیہ بن ابی صلت دورِ جاہلیت کا شاعر تھا۔ اس کی شاعری میں توحید باری تعالیٰ کے مضامین تھے۔ اس نے اسلام کا زمانہ پایا لیکن بدقسمتی سے اسلام قبول نہ کیا۔ اس کے باوجود رسول اکرم ﷺ اس کے اشعار کو پسند فرماتے تھے۔ عمرو بن شرید نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھا کہ آپ ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا تیرے پاس امیہ بن ابی صلت کے اشعار ہیں؟ میں نے کہا، ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا، تو لاؤ۔ اس پر میں نے ایک شعر پڑھ کر سنایا۔ آپ ﷺ بار بار یہی فرماتے رہے کہ شعر سناتے جاؤ تو میں نے اس کے سو شعر پڑھ دیئے۔ (۱۹/ ب) حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ حضرت حسانؓ بن ثابت کے لئے رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی میں ایک منبر رکھا ہوا تھا جس پر کھڑے ہو کر وہ قریش مکہ کی ہجو کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کی اپنے اشعار میں مدح و توصیف بیان کیا کرتے تھے۔ (۱۹/ ج) حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعض شعر دانائی ہوتے ہیں۔ (۲۰/ الف) سورۂ شعرا میں ہے کہ شعراء کی پیروی بھٹکے ہوئے لوگ کرتے ہیں۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ وہ (شعرا) ایک ایک بیابان میں سرٹکراتے پھرتے ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ویسا کرتے نہیں۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل کئے اور بہ کثرت اللہ کا ذکر کیا اور اپنی مظلومی کے بعد (شاعری کے ذریعے دشمنوں سے) انتقام لیا (وہ اس سے مستثنیٰ ہیں) اور جنہوں نے (شاعری کے

ذریعے یا جیسے بھی) ظلم کیا وہ عن قریب جان لیں گے کہ وہ کس کروٹ اُلٹتے ہیں۔ (۲۰/ب) مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ سارے شعر برے نہیں ہوتے۔ اب اگر سورۂ یٰس کے مذکورہ مضمون سے پیچھا چھڑانے کے لئے یہ دوراز کار تاویل کی جائے کہ یہاں شعر سے مراد عرفی شعر نہیں بل کہ جھوٹی باتیں اور توہمات مراد ہیں۔ یا صرف مذموم اشعار مراد ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ ہم نے اپنے عزیز کو گالیاں نہیں سکھائی ہیں وغیرہ وغیرہ، تو ایسی تمام تاویلات کی جڑ متعلقہ آیت کے کلمات وَمَا يَنۡبَغِیۡ لَه (اور شاعری اس کے لائق نہیں) نے کاٹ کے رکھ دی ہے۔ مذموم اشعار، غلیظ اقوال، حق کے مقابلے میں وہمی اور تخیلاتی باتیں، مفصل کی بہ جائے ناحق مبہم، مشتبہ اور گول مول باتیں وغیرہ زید، عمرو، بکر کسی کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں تو اس میں رسول اللہ ﷺ ہی کی کیا تخصیص ہے؟ اس صورت میں آیت کے یہ کلمات (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) فالتو اور غیر ضروری ٹھہرتے ہیں۔ ایسی تاویلات کو سورہ الحاقۃ کی اس آیت نے بھی بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا ہے۔ **وما ھو بقول شاعر قلیلا ماتومنون** (۲۰/ج) ''اور وہ (قرآن) کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم بہت کم یقین رکھتے ہو۔'' دیکھئے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ قرآن شعر نہیں بل کہ یہ فرمایا گیا کہ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جاتا کہ قرآن شعر و شاعری نہیں ہے تو اس سے خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے شعر گوئی کی نفی نہ ہوتی۔ یہ فرما کر کہ قرآن کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، خوب واضح کر دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ ہرگز ہرگز شاعر نہیں ہیں۔ اسی سورہ الحاقۃ میں اگلی آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے وَلَا بِقَوۡلِ کاھن قَلِیۡلاً مَّاتَذَکَّرُوۡن ''اور نہ ہی یہ (قرآن) کسی کاہن کا قول ہے تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔'' قرآن کریم سے ثابت ہے کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ کو ساحر (جادوگر) بھی کہا کرتے تھے مثلاً سورۂ یونس میں ہے قَالَ الۡکَافِرُوۡنَ اِنَّ ھٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِیۡنٌ (۲۱/الف) ''کافروں نے کہا کہ یہ (پیغمبر) تو صریح جادوگر ہے۔ الغرض قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا خود ساختہ نہیں کہ آپ نے شاعر، کاہن یا ساحر کی حیثیت سے اسے خود گھڑ لیا ہو، آپ ﷺ شاعر، کاہن یا ساحر نہیں ہیں۔ اب غور کیجئے قرآن کریم میں ہرگز اس طرح کا مضمون نہیں ملے گا کہ جادوگری اور کہانت اس پیغمبر کے لائق نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جادوگری اور کہانت تو ہر شخص کے لئے مذموم اور ممنوع ہے۔ اس میں رسول اکرم ﷺ ہی کی کیا تخصیص ہے؟ پس شعر گوئی کے متعلق یہ ارشاد کہ شاعری اس پیغمبر کے لائق نہیں ہے، صاف طور پر یہ واضح کر رہا ہے کہ اس میں مذموم شاعری تو بالاتفاق شامل ہے ہی، اچھی شاعری بھی اس میں بہ طریق اولیٰ شامل ہے۔ لہٰذا آیت میں کسی فاسد تاویل کی جڑ خود کتاب اللہ نے کاٹ دی ہے۔ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی بھی طرح کی شاعری کا علم نہیں دیا گیا کہ یہ آپ کے لئے موزوں ہی

نہیں، آپ ﷺ کے اعلیٰ وارفع منصب نبوت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں لہٰذا شاعری سے باخبر نہ ہونے سے آپ کی توہین نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ شعر گوئی اور چیز ہے اور شعر فہمی اور بات ہے۔ اگر آپ عالم جمیع ما کان و ما یکون ہوتے تو ضرور بالضرور شاعر بھی ہوتے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر آپ شاعر ہوتے تو اچھے اشعار تو آپ ﷺ کو بہت پسند تھے۔ آپ امیہ بن صلت جیسے کافر شاعر کے بھی اچھے اشعار ذوق وشوق سے سنا کرتے تھے۔ یوں آپ ﷺ خود بھی ضرور بالضرور شعر گوئی فرماتے اور آپ کا دیوان ہم تک آپ ﷺ کی احادیث کی طرح نہایت ہی اہتمام اور حفاظت سے ضرور بالضرور منتقل ہوتا۔ رجز یہ کلمات جو بلا قصد زبان پر جاری ہو جائیں اُنہیں عرف اور اصطلاح میں شعر نہیں کہا جاتا، لہٰذا تمام شبہات اور تاویلات کالعدم ہیں۔ حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شعر کے کلمات کو (غیر اختیاری طور پر) مقدم ومؤخر کر کے اُلٹ پلٹ پڑھا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اس (پیغمبر) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اس کی شان کے لائق ہے۔ (۲۱/ ب)

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی طرفہ شاعر کا شعر پڑھا کرتے تھے لیکن شعر آپ ﷺ سے اُلٹ پلٹ ہو جاتا تھا تو ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! یہ شعر یوں نہیں بل کہ یوں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا، ''واللہ! میں شاعر نہیں اور نہ ہی شاعری میرے لائق ہے۔'' (۲۱/ ج)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے چوٹی کے اصحابِ رسول آپ ﷺ کو شاعر نہیں سمجھتے تھے بالفاظ دیگر وہ آپ ﷺ کو عالم جمیع ما کان و ما یکون قرار نہیں دیتے تھے۔ ان مضامین کی مزید تائید رسول اللہ ﷺ کے اس تعوذ سے بھی ہوتی ہے۔ **اللھم انی اعوذبك من علم لاینفع** (۲۲/ الف)۔ ''اے اللہ! میں اس علم سے جو نافع نہ ہو تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔'' یہاں 'علم' عام ہے۔ کسی بھی بات کو جان لینا علم ہے۔ مخلوق کے لئے بعض چیزوں کا علم بسا اوقات قطعاً غیر مفید اور بے مقصد ہوتا ہے۔ مثلاً زید روزانہ اپنے گھر کی مرغیوں کی بیٹیں شمار کر کے ان کی صحیح تعداد معلوم کرنے کا شوق رکھتا ہو یا مثلاً عمرو اپنے گھر کی مکھیوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے درپے ہو۔ یا مثلاً بکر اپنے بچوں کے سر کے بالوں کو شمار کر کے ان کا ریکارڈ مرتب کرنا چاہتا ہو تو یقیناً زید، عمرو اور بکر کی ذہنی صحت پر شبہہ کیا جائے گا۔ پس مخلوق کے لئے کچھ علوم قطعاً نفع بخش نہیں ہوتے ورنہ رسول اللہ ﷺ کے تعوذ کے کلمات کچھ یوں ہوتے۔ **اللّٰھم انی اعوذبك من علم لاانتفع به** ''اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں جس سے میں فائدہ نہ اُٹھاؤں۔'' یہ کہنا بھی درست نہیں کہ شے ادنیٰ ہو تو ہو لیکن اس کا علم کبھی ادنیٰ

نہیں ہوتا۔ دیکھئے بچوں کے سر پر بالوں کا ہونا ''ادنیٰ شئے'' نہیں بل کہ جسمانی حسن میں شامل ہے، گنجا ہونا عیب ہے لیکن ان کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے دَرپے ہونا اور روزانہ ان کی گنتی کر کے یہ معلوم کرنا کہ کتنے بال گرے ہیں اور کتنے نئے اُگے ہیں اور ان کا ریکارڈ مرتب کرنا، تو ایسا علم ادنیٰ ہی نہیں بل کہ دیوانگی کی علامت ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے علم محیط و تفصیلی پر کوئی اشکال نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ کا علم حصولی نہیں بل کہ حضوری ہے، یعنی از خود اس کے پاس ہے کسی ذریعے اور سبب سے وہ اسے حاصل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ خواہ کوئی مخلوق چھوٹی ہو یا بڑی، ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، اس کی حفاظت اور بقا کا لازمی تقاضا ہے کہ اس مخلوق کا اور اس کے تمام متعلقات کا رب العالمین کو پورا پورا علم ہو۔ غور کیجئے اپنے خانہ ساز جھوٹے عقیدوں کی پرورش کے لئے اور قرآن کریم کی محکمات اور رسول اللہ ﷺ کے واضح کلمات سے پیچھا چھڑانے کے لئے لوگ (غالباً غیر شعوری طور پر) کیسی کیسی لغویات پر اُتر آتے ہیں اسی طرح عین ممکن ہے کہ کوئی علم زید کے لئے تو مفید ہو لیکن عمرو کے لئے قطعاً مناسب نہ ہو۔ شعر گوئی خواہ پُر حکمت ہی کیوں نہ ہو، شعرا کے مناسب حال تو ہو سکتی ہے لیکن رسول اکرم ﷺ کے لئے ہرگز موزوں قرار نہیں دی گئی تا کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ آپ ﷺ نے قرآن اپنے ملکۂ شاعری کے زور پر خود تصنیف کر ڈالا ہے اور اگر کوئی ناحق ایسا دعویٰ کرے تو اس کا جھوٹا ہونا واضح ہو جائے۔ نیز دیکھئے لکھنا پڑھنا یقیناً مفید ہے لیکن رسول اکرم ﷺ کو اُمّی رکھا گیا، تا کہ لوگ اس شبہے میں نہ پڑیں کہ آپ نے پہلے سے حاصل کردہ علم کے زور پر قرآن از خود بنا لیا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ کوئی کتاب اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا کہ یہ باطل پرست لوگ کسی شک و شبہہ میں پڑتے۔'' (۲۲/ب) الغرض دیگر لوگوں کی طرح کسی بھی پیغمبر کے لئے بے فائدہ، یا مفید ہونے کے باوجود سراسر غیر متعلق علم ہرگز اس کے مناسب حال نہیں۔ کوئی بھی پیغمبر عالم جمیع ما کان و ما یکون نہیں ہوا کرتا۔

ب: کیا بروز قیامت لوگوں کا حساب کتاب اور ان کا جنت یا جہنم میں داخلہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یا اس نے یہ ذمے داری کسی نبی حتیٰ کہ رسول اکرم ﷺ کے سپرد فرما دی ہے؟ اگر یہ ذمے داری آپ کے سپرد فرما دی ہے تو لازماً ہر شخص کے رائی کے دانے کے برابر بھی اچھے اور برے اعمال سے آپ ﷺ کو باخبر ہونا چاہئے۔ اگر یہ ذمے داری آپ کے سپرد نہیں کی گئی ہے تو آپ ﷺ کا ہر ہر فرد کے اعمال کی تفصیلات سے باخبر ہونا اور اس پر ہر وقت نظر رکھنا یعنی آپ ﷺ کا عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہونا سراسر غیر متعلق ہوگا۔ چناں چہ سورۂ رعد میں ہے فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۲۲/ج) ''سو تیرے ذمے تو (دین کو لوگوں تک) پہنچانا ہے اور حساب ہمارے ذمہ ہے۔'' اور مثلاً سورۂ غاشیہ میں ہے

فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ o لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ o (۲۳/الف) ''سو تو نصیحت کرتا رہ کہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر نگران نہیں ہے۔'' نیز اسی سورت میں ہے اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابَهُمْ o ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ o (۲۳/ب) ''بے شک ہماری طرف ہی ان کا لوٹ کر آنا ہے۔ پھر بے شک ہمارے ذمے ان کا حساب ہے۔'' سورۂ انعام میں ہے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۲۳/ج) ''اور ہم نے تجھے ان پر نگران نہیں بنایا ہے۔'' اور اسی سورۂ انعام میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) ان کا حساب ذرا بھی تیرے ذمے نہیں اور نہ ہی تیرا حساب ذرا بھی ان کے ذمے ہے۔'' (۲۴/الف) سورۂ شوریٰ میں ہے کہ اگر وہ منہ پھیریں فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۲۴/ب) ''تو ہم نے تجھے ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے۔'' اور اسی سورۂ شوریٰ میں ہے اَللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۲۴/ج) ''اللہ ان پر نگران ہے اور تو ان کا ذمہ دار نہیں ہے۔'' سورۂ شعرا میں ہے قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ o اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ o (۲۵/الف) ''(نوح نے) کہا کہ مجھے ان لوگوں کے اعمال کا (یقینی اور تفصیلی) علم نہیں ہے، ان کا حساب تو صرف میرے رب کے ذمے ہے اگر تم سمجھ پاؤ۔'' سورۂ انعام میں ہے کہ ''جن لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ بہت سے فرقوں میں بٹ گئے، تیرا ان سے کچھ تعلق نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے پھر وہ اُنہیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔'' (۲۵/ب) سورۂ ملک میں ہے کہ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ (قیامت وغیرہ کا) یہ وعدہ کب پورا ہوگا تو کہہ دے اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (۲۵/ج) ''اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے اور میں تو محض صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔'' سورۂ اعراف میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میں اپنی جان کے نفع ونقصان کا بھی مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی (دنیوی) بھلائیاں اکٹھی کر لیا کرتا اور مجھے کوئی (دنیوی) تکلیف نہ پہنچا کرتی۔ میں تو صرف (نہ ماننے والوں کو) ڈرانے والا اور ایمان والوں کو خوش خبری سنانے والا ہوں۔'' (۲۶/الف) ان مضامین سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا کام اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانا، نہ ماننے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا، ماننے والوں کو اللہ کی رحمت کی بشارت دینا، ان کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وتطہیر ہے۔ پیغمبر کو لوگوں کے اعمال پر نگران بنا کر نہیں بھیجا جاتا کہ وہ ہر ایک کے عمل کو تفصیلاً جاننے اور ہر شخص کے ظاہر و باطن سے پوری طرح باخبر رہنے کا پابند ہو۔ پیغمبر زیر تربیت مومنین کے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لئے ضروری حد تک ہی ان پر نظر رکھتے ہیں۔ اسی معنی میں اُنہیں شاہد وشہید کہا جاتا ہے۔ مخلوق کے اعمال کا بہ روزِ قیامت حساب پیغمبر کے ذمے نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اس لئے وہ اپنی مخلوق

کے ذرے ذرے سے پوری طرح اور ہمہ وقت باخبر ہے۔ جب لوگوں کا حساب لینا اور انہیں جنت یا جہنم میں بھیجنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس لئے عقل سلیم کا بدیہی فیصلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے تمام احوال واعمال سے پوری طرح باخبر ہونا چاہئے۔ مخلوق کو غیب کلی کا علم دینے کی قطعاً کوئی ضرورت ہی نہیں۔ چناں چہ مثلاً سورۂ سبا میں ہے کہ ''کفار کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی تو کہہ دے کہ مجھے میرے عالم الغیب رب کی قسم! یہ تم پر ضرور آئے گی۔ اس کے علم سے نہ آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں اور نہ ہی کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی ہے جو کتاب مبین (لوح محفوظ) میں نہ ہو۔'' (۲۶/ب) اس کے فوراً بعد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ ۝ (۲۶/ج) ''تاکہ (اللہ) ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو بھلا بدلہ عطا فرمائے یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔ اور ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کی جنہوں نے کوشش کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے بدترین قسم کا عذاب ہے۔'' اور مثلاً سورۂ انعام میں ہے کہ ''صرف اسی (اللہ) کے پاس ہی غیب کی کنجیاں ہیں۔ انہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہے اور جو سمندروں (اور دریاؤں وغیرہ) میں ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اسے بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی تر یا خشک چیز ہے مگر یہ سب کچھ کتاب مبین (لوح محفوظ) میں ہے اور وہی رات کو تمہاری روح کو (ایک حد تک) قبض کر لیتا ہے پھر تم کو (نیند سے) جگا دیتا ہے'' لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۷/الف) ''تاکہ میعادِ معین پوری کر دی جائے پھر تم کو اسی کی طرف جانا ہے پھر وہ تم کو بتلائے گا جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے رہے تھے۔'' اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے اس لئے بھی پوری طرح باخبر ہے کہ وہی رازقِ حقیقی بھی ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں ہے کہ ''زمین پر چلنے والا کوئی جان دار بھی ایسا نہیں ہے کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو اور وہ ہر ایک کے رہنے سہنے اور سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کھلی کتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہے۔'' (۲۷/ب) اور مثلاً سورۂ فاطر میں ہے کہ ''اے لوگو! تم اپنے اوپر اللہ کے انعامات یاد کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی پہنچائے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم کہاں اُلٹے پھرے جاتے ہو؟'' (۲۷/ج) اور مثلاً سورۂ زخرف میں ہے کہ ''کیا تیرے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ان کے درمیان دنیا کی زندگی میں روزی کی تقسیم کی ہے۔'' (۲۸/الف) پس

مخلوق کا ایک دوسرے کو روزی پہنچانا ماتحت الاسباب یعنی محدود اختیاری اسباب کے تحت ہے۔ مافوق الاسباب یعنی غیر اختیاری اسباب کے تحت مخلوق ہرگز کسی میں روزی تقسیم نہیں کرتی۔ ہم نے اسے ''اختیار کلی'' کے مباحث میں بہ خوبی واضح کیا ہے۔ (۲۸/ ب) اللہ تعالیٰ اس لئے بھی اپنی مخلوق سے پوری طرح باخبر ہے کہ وہی پوری کائنات کا مدبر اور مخلوق کی تمام چھوٹی اور بڑی ضروریات کا کفیل ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے کہ ''وہ (اللہ) آسمان سے لے کر زمین تک ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔'' (۲۸/ ج) اور مثلاً سورۂ ابراہیم میں ہے کہ ''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمان سے بارش برسا کر اس کے ذریعے تمہاری روزی کے لئے پھل نکالے ہیں اور کشتیوں کو تمہارے بس میں کر دیا ہے کہ وہ دریاؤں میں اس کے حکم سے چلیں پھریں۔ اسی نے نہریں اور ندیاں تمہارے اختیار میں کر دی ہیں۔ اسی نے سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے کہ وہ برابر چل رہے ہیں اور رات اور دن کو بھی اس نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ اسی نے تمہاری منہ مانگی کل چیزوں میں سے (حسب موقع وضرورت) تمہیں دے رکھا ہے۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو تم انہیں پورا گن بھی نہیں سکتے۔ یقیناً (کفرونا فرمانی پر ڈٹ جانے والا) انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔'' (۲۹/ الف) پورے قرآن میں ایسے مضامین کسی بھی مخلوق کے لئے حتیٰ کہ بعد از خدا بزرگ توئی کے مصداق سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ کے لئے بھی نہیں ملیں گے۔ پس عالم الغیب، مختار مطلق، حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہونا اللہ تعالیٰ کے لئے تو ناگزیر ہے مگر مخلوق کو ان صفات کی قطعاً ضرورت ہی نہیں اور نہ ہی یہ صفات اس کے لئے کمال ہیں۔

۵۔ بہ حوالہ علم تفصیلی وکلی، علم محیط وبسیط

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے علم غیب کو بیان کرنے کے لئے اس طرح کے کلمات ارشاد فرمائے: **عَالِمُ الْغیبِ وَالشَّهَادَةَ، عَالِمُ الْغَیبِ، عَلَّامُ الْغُیُوْبِ، لِلّٰهِ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ''اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کا غیب ہے'' وغیرہ اپنے علم کلی کو ظاہر کرنے کے لئے اس طرح کے کلمات جابہ جا ارشاد فرمائے: **اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ** (بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے)، **وَکُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ عَالِمِیْنَ** (اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں)، **وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ** (اور وہ ہر مخلوق کو جانتا ہے)، **وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا** (اور اس نے ہر چیز کی تعداد کا احاطہ کر رکھا ہے) وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم محیط کا حوالہ بھی قرآن کریم میں جابجا دیا ہے: **اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ** (بے شک اللہ ان کے عملوں کا احاطہ کرنے والا ہے)، **اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ** (بے شک میرا رب تمہارے عملوں

کا احاطہ کئے ہوئے ہے)، وَاِنَّ اللّٰهَ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْماً (اور بے شک اللہ نے بلحاظ علم ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے) وغیرہ۔ اپنے علم کے کامل ہونے کو ذہن نشین کرانے کے لئے جابہ جا اس طرح کے کلمات ارشاد فرمائے: يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے)، وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ من شَیْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (اور اللہ پر زمین میں اور نہ ہی آسمان میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں)، وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اور تیرا رب آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، سب کو بہ خوبی جانتا ہے) وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے جابجا یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہ اچھے اور برے ہر طرح کے لوگوں کو بہ خوبی جانتا ہے: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ (اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے) وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے)، فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ "تو بے شک اللہ فسادیوں کو خوب جانتا ہے"، اِنَّ رَبُّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ "بے شک تیرا رب زیادتی کرنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہے" وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بار بار بتایا ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ "تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے"، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ "اور اللہ تمہارے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے"، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآءِ كُمْ "اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے" وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار ارشاد فرمایا ہے کہ وہ دلوں کا حال بھی جانتا ہے: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ "اور اللہ سینوں کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے"، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ "اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے"، وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ "اور ہم خوب جانتے ہیں جو اس (کی مخلوق) کے دل میں وسوسے آتے ہیں اور ہم اس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں" وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بار ہا ظاہر فرمایا ہے کہ وہ ہر کسی کے ظاہر و باطن دونوں سے باخبر ہے: وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ "اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو"، يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ "وہ تمہارے چھپے اور ظاہر حال کو جانتا ہے اور جانتا ہے جو عمل تم کماتے ہو، يعلمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ "وہ ان کے اگلے پچھلے سب احوال کو جانتا ہے" وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار ارشاد فرمایا کہ وہ تمہارے نیک عملوں کو جانتا ہے: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ "اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو تو اللہ اسے جانتا ہے"، وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ "اور جو کوئی مال تم خرچ کرو یا کوئی نذر مانو تو بے شک اللہ اسے جانتا ہے" وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ وہ تمہارے برے کاموں کو بھی جانتا ہے: وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ بَصِيْراً "وہ اپنے بندوں کے گناہوں کو دیکھنے

کے لئے کافی ہے)''۔ وَکَفٰی بِرَبِّکَ بِذُنُوْبِ عِبَادِہٖ خَبِیْراً بَصِیْراً ''اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونے اور اُنہیں دیکھنے کے لئے کافی ہے'' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بارہا یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہ تمہارے سب اعمال کو جانتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ''بے شک اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں''، وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ''اور اللہ تمہارے اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے''، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا تَصْنَعُوْنَ ''اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو''، وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ''اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے''، اِنَّہٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ''بے شک وہ ان کے اعمال سے باخبر ہے'' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بارہا یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ کسی کے اعمال سے بے خبر نہیں وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ''اور اللہ تمہارے عملوں سے بے خبر نہیں''۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلاً عَمَّا یَعْمَلُ الظَّالِمُوْنَ ''اور تو ہرگز اللہ کو ظالموں کے اعمال سے بے خبر نہ سمجھ''، وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُ الظَّالِمُوْنَ ''اور تیرا رب ظالموں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے'' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار یہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے لیکن مخلوق کی یہ شان نہیں: قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ''اللہ نے (فرشتوں سے) کہا کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''، وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ ''اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے''، وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ ''اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا'' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بارہا یہ فرمایا ہے کہ قیامت کا علم صرف اور صرف اسی کے پاس ہے قُلْ اِنَّمَا عِلْمُھَا عِنْدَ اللّٰہِ ''تو کہہ دے کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے''، وَعِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ ''اور قیامت کا علم اسی کے پاس ہے''، اِلَیْہِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَۃِ ''قیامت کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے'' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے بارہا ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے: اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ''بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے''، وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْباً ''اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے''۔ وَاللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَاتَعْمَلُوْنَ ''اور اللہ، جو عمل بھی تم کرتے ہو اس پر حاضر و موجود ہے''، اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ''بے شک وہ جو عمل تم کرتے ہو اسے دیکھنے والا ہے'' اِنَّہٗ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرٌ بَصِیْر ''بے شک وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، دیکھتا ہے''، اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ بَصِیْرٌ ''بے شک وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے''، وَھُوَا السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ''اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے''، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعاً بَصِیْراً ''بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے''، اَبْصِرْ بِہٖ وَاَسْمِعْ ''اس کا دیکھنا کیسا ہی عمدہ دیکھنا اور اس کا سننا کیسا ہی عمدہ سننا ہے'' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ ہر دم تمہارے ساتھ ہوتا ہے وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ ''اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی تم ہو'' وَاللّٰہُ مَعَکُمْ وَلَنْ یَّتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْ ''اور اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ ہرگز تمہارے اعمال ضائع نہیں کرے

گا''، وهو مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَالَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ''اور وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو ناگفتنی باتوں کے مشورے کر رہے ہوتے ہیں'' وغیرہ۔ اس طرح کے مضامین اس کثرت اور تکرار سے موجود ہیں کہ ہم نے ان مضامین کا حوالہ دینے کی یہاں ضرورت محسوس نہیں کی۔ اہل علم متعلقہ حوالے کی کتب مثلاً المعجم المفہرس لالفاظ القرآن کریم مؤلفہ محمد فواد الباقی میں ''علم، عمل، شھد، حوط، بصر، سمع وغیرہ کے مادوں اور ان کے مشتقات کو دیکھ سکتے ہیں، اس طرح کے سیکڑوں مضامین ان کے سامنے ہوں گے۔ قرآن کریم میں اس طرح کے مضامین مخلوق کے حق میں ہرگز نہیں ملتے۔ مثلاً اس طرح کا مضمون کہیں بھی نہیں ملے گا کہ آدم علیہ السلام ہر چیز کو جانتے اور دیکھتے ہیں۔ چناں چہ اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ شجر ممنوعہ کے پاس جانے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوگا اور جنت سے نکل کر زمین پر آنا پڑے گا۔ اور مثلاً قرآن کریم میں یہ مضمون کہیں نہیں ملے گا کہ نوح علیہ السلام کھلی اور پوشیدہ باتوں کو جانتے ہیں۔ چناں چہ اُنہیں اپنے بیٹے کے انجام کا علم نہیں تھا اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بیٹے کے حق میں دعا سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوگی، اور مثلاً قرآن کریم میں ہرگز اس طرح کا مضمون نہیں ملے گا کہ ابراہیم علیہ السلام پر آسمانوں اور زمین میں کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے۔ چناں چہ عمر کے آخری حصے میں بڑھاپے کے عالم میں بھی اُنہیں ان فرشتوں کا علم نہیں تھا جو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت دینے آئے تھے۔ اُنہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قوم لوط کے حق میں ان کی سفارش اللہ قبول نہیں کرے گا۔ اور مثلاً قرآن کریم میں ہرگز اس طرح کا مضمون نہیں ملے گا کہ یعقوب علیہ السلام علام الغیوب ہیں، آسمانوں اور زمین کا غیب یعقوبؑ کو دیا گیا تھا۔ چناں چہ اُنہیں سال ہا سال اپنے صاحبزادے حضرت یوسفؑ کا علم نہ ہوسکا اور ان کے فراق میں طویل مدت تک روتے رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ہمارے ابا جی علام الغیوب اور حاضر و ناظر ہیں تو وہ اپنے باپ کو دھوکہ دے کر حضرت یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جا کر کنویں میں پھینک آنے اور گھر آ کر اپنے باپ سے یہ کہنے کی ہرگز ہرگز جسارت نہ کرتے کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ اور مثلاً قرآن کریم میں ہرگز اس طرح کا مضمون نہیں ملے گا کہ موسیٰ علیہ السلام ہر چیز پر نگہ بان اور ہر چیز سے باخبر ہیں۔ چناں چہ پوری تورات مل جانے کے بعد بھی اُنہیں معلوم نہ تھا کہ قوم کی گوسالہ پرستی کے معاملے میں حضرت ہارونؑ نے ادنیٰ سے ادنیٰ تساہل سے بھی کام نہیں لیا۔ اُنہوں نے عالم غیظ و غضب میں کوہِ طور سے آتے ہی تورات کی تختیوں کو ایک طرف رکھا اور اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو سر اور داڑھی کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا اور مثلاً قرآن کریم میں ہرگز اس طرح کا مضمون نہیں ملے گا کہ عیسیٰؑ کو ہر ہر بات کا علم دیا گیا ہے۔ چناں چہ قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے

صاف اقرار فرمائیں گے کہ اے اللہ! تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے ہاں ہے۔ بے شک تو ہی غیبوں کو جاننے والا ہے، اور مثلاً پورے قرآن میں اس طرح کا ہرگز ہرگز مضمون نہیں ملے گا کہ اگر کسی درخت کا کوئی پتہ بھی گرتا ہو یا کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی کہیں پوشیدہ ہو تو خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کو اس کا پورا پورا علم ہے۔ چناں چہ اپنی عمر مبارک کے آخری حصے میں غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ ﷺ کو منافقین کا پتہ نہ چلا۔ مسجد ضرار بنانے والے منافقین کا بھی آپ کو پہلے پہل علم نہ ہوا۔ آپ ﷺ کو معلوم نہیں تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھانا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور یہ کہ آئندہ کے لئے منافقوں کی قبر پر کھڑے ہونے تک سے آپ ﷺ کو منع کر دیا جائے گا۔ آپ کے مرض وفات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بہ جائے جب حضرت عمرؓ امامتِ نماز کے لئے آگے بڑھے تو حضرت عمرؓ کی آواز سنے بغیر آپ ﷺ کو صورت حال کا علم نہ ہوا۔ ان کی آواز سن کر آپ نے اُنہیں پیچھے ہٹنے کا حکم صادر فرمایا کہ نماز کی امامت صرف ابوبکر صدیقؓ ہی فرمائیں گے۔ آخرت میں آپ ﷺ کو امتیوں کی پہچان وضو کے آثار سے چمکنے والے چہروں، ہاتھوں اور پاؤں سے ہوگی، حال آں کہ عالم الغیب اور حاضر و ناظر کو کسی کے پہچاننے کے لئے ہرگز کسی ظاہری علامت کی ضرورت نہیں ہوا کرتی وہ تو ظاہر و باطن دونوں سے بہ خوبی واقف ہوتا ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے متعلق ان مضامین اور دیگر متعلقہ امور کی باحوالہ وضاحت آئندہ مباحث میں ہم مناسب مقام پر کریں گے۔ قرآن کریم کے ان نہایت ہی واضح، کھلے، محکم اور روشن مضامین کے باوجود کوئی حضرات انبیاء علیہم السلام کو عالم الغیب اور حاضر و ناظر سمجھنے پر مصر ہو تو ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص یہی محسوس کرے گا کہ ایسے لوگوں نے حُبِ انبیاء اور حُبِ اولیا کی آڑ میں کتاب اللہ کی مخالفت کرنے کی قسم اُٹھا رکھی ہے۔

۶۔ بہ حوالہ بحث ذاتی و عطائی

الف: مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی عطا کے بغیر ذاتی طور پر یعنی از خود بالاتفاق ایک ذرے بل کہ اس سے بھی کم کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ان مباحث میں عقلاً اختلاف اور نزاع صرف اور صرف اسی شق میں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی مخلوق کو کسی بھی دور کا غیب کلی کا علم عطا فرمایا ہے یا نہیں۔ ان مباحث میں ہم نے مضامین کو اس طرح مرتب کیا ہے جس سے یہ واضح ہو سکے کہ مخلوق میں سے کسی کو حتیٰ کہ سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ کو بھی غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا۔ تمام اشکالات اسی (مفروضہ) عطائی علم پر ہی وارد ہوتے ہیں کہ ذاتی علم والی شق تو پہلے ہی سے خارج از بحث ہے اور اسی عطائی علم کے غلط مفروضے سے ہی

حضرات انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظام کی توہین لازم آتی ہے اور ان کا مرتبۂ عبدیت خلل پذیر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جو لوگ ذاتی اور عطائی کی آڑ میں قرآن کریم کی متعلقہ آیات میں معنوی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں ان کے لئے سابقہ مباحث کے علاوہ درج ذیل نکات بھی توجہ طلب ہیں۔ ٹھنڈے دل سے ان پر غور فرمایا جائے تو حق و باطل میں امتیاز مشکل نہیں ہے:

۱۔ کیا رسول اللہ ﷺ کا وجود مبارک ذاتی ہے یا عطائی؟ اگر عطائی اور یقیناً عطائی ہے تو آپ نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ میں موجود نہیں ہوں؟ حال آں کہ اس کی بھی یہی تاویل کی جاسکتی تھی کہ یہاں ذاتی وجود کی نفی مراد ہے، عطائی کی نہیں۔

۲۔ کیا رسول اللہ ﷺ کی رسالت و نبوت ذاتی ہے یا عطائی؟ اگر عطائی اور یقیناً عطائی ہے تو آپ ﷺ نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ میں رسول نہیں ہوں، میں نبی نہیں ہوں، میں خاتم النبیین نہیں ہوں وغیرہ۔ یا اس طرح کی آیات قرآن کریم میں کیوں نہیں ہیں؟ حال آں کہ اس کی تاویل بھی کی جاسکتی تھی کہ یہاں ذاتی رسالت و نبوت اور ذاتی ختم نبوت کی نفی مقصود ہے، عطائی کی نہیں۔ میں ذاتی طور پر از خود رسول نہیں بن گیا، ذاتی طور پر خاتم النبیین نہیں ہوگیا، میں ذاتی طور پر یعنی از خود رسول بن جانے کا دعویٰ نہیں کرتا (کیوں کہ بہ قول ان حضرات کے کسی چیز کا مدعی وہی ہوسکتا ہے جو اس کا ذاتی طور پر مالک ہو) میں عطائی رسالت و نبوت اور عطائی ختم نبوت کی نفی نہیں کر رہا ہوں۔

۳۔ قرآن کریم میں ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔'' اس طرح کی کوئی آیت کیوں نازل نہ ہوئی جس کا مفہوم یہ ہوتا کہ محمد اللہ کا رسول نہیں ہے اور جو اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان نہیں ہیں؟ حال آں کہ یہاں بھی یہ تاویل کی جاسکتی تھی اور ''آپ، خود'' جیسے کلمات ترجمے میں شامل کئے جاسکتے تھے کہ ''محمد آپ رسول نہیں بن گئے ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ آپ یا از خود کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان نہیں ہیں۔'' بل کہ محمد ﷺ کی رسالت اور صحابہ کرام کا کافروں پر سخت ہونا اور آپس میں ان کا مہربان ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطائی ہے۔

۴۔ عیسائی یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت ذاتی نہیں بل کہ عطائی ہے اور اس سے کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ کیا آپ ان سے متفق ہیں؟ اگر کہا جائے کہ الوہیت (خدائی) کسی مخلوق کو دینے کی چیز نہیں تو بعینہٖ یہی بات غیب کلی کے علم کے متعلق بھی ہے کہ یہ صفت بھی کسی مخلوق کو دینے کے لائق نہیں۔ جن و انس عقل رکھنے والی مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے اور

حضرات انبیاء علیہم السلام اللہ کی عبادت میں سب سے آگے ہوتے ہیں اگر انہیں غیب کلی کا علم عطا کر دیا جائے اور حاضر و ناظر بنا دیا جائے تو ان کا مرتبۂ عبدیت خلل پذیر ہوگا، کوئی آزمائش ان کے لئے آزمائش ہی نہیں رہے گی، وہ لوگوں کے لئے نمونۂ عمل ہی نہیں بن سکیں گے، ایسا علم ان کے لئے کمال نہیں بل کہ اُلٹا وبالِ جان بن جائے گا جیسا کہ ہم گزشتہ مباحث میں بہ خوبی واضح کر چکے ہیں بل کہ ان پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع اور کتمائی علم جیسے سنگین الزامات بھی عائد ہوں گے بل کہ اپنے ساتھیوں، قریبی اعزہ و اقارب حتیٰ کہ اپنی بیویوں پر مہربان ہونے کی بہ جائے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ظالم اور سنگ دل ہونے کے الزامات بھی عائد ہوں گے، جیسا کہ ان شاء اللہ العزیز آئندہ مباحث میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے متعلق واقعات وحوادث سے بہ خوبی واضح ہو جائے گا۔

۵۔ کیا اللہ تعالیٰ کا وجود ذاتی ہے یا عطائی؟ اگر ذاتی ہے اور یقیناً ذاتی ہے تو قرآن کریم میں اس طرح کے مضامین کیوں نہیں ہیں کہ اللہ کا وجود ہی نہیں حال آں کہ یہاں بھی یہ تاویل کی جا سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے عطائی وجود کی نفی مراد ہے، ذاتی کی نفی مراد نہیں۔

۶۔ کیا اللہ تعالیٰ کی صفات علم، سمع، بصر وغیرہ ذاتی ہیں یا عطائی؟ اگر ذاتی ہیں اور یقیناً ذاتی ہیں تو قرآن کریم میں اس طرح کے مضامین کیوں نہیں کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) سمیع و بصیر اور علیم و قدیر نہیں ہے وغیرہ؟ حال آں کہ یہاں بھی یہ تاویل کی جا سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے عطائی صفات کی نفی کی جا رہی ہے، ذاتی کی نفی مراد نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات کا عطائی ہونا سراسر خلافِ عقل اور خارج از بحث ہے تو بعینہٖ یہی بات ہم کہتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بلکہ کسی بھی مخلوق کے وجود اور اس کی صفات کا ذاتی ہونا سراسر خلافِ عقل اور خارج از بحث ہے لہٰذا ذاتی اور عطائی کی آڑ میں قرآن وسنت کی نصوصِ صریحہ (واضح اور روشن مضامین) کی تکذیب کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔

۷۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مرزا قادیانی خود نبی نہیں بن گیا تھا بل کہ رسول اللہ ﷺ کی مہر سے نبی بنا ہے۔ مرزا کی (مزعومہ) نبوت عطائی ہے، ذاتی نہیں اور اس سے رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر کوئی زد نہیں پڑتی تو کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ اگر نہیں تو قرآنی مضامین میں جو حقائق اور عقائد مذکور ہیں انہیں بھی ذاتی اور عطائی کی آڑ میں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

۸۔ جب مخلوق کا وجود ہی ذاتی نہیں تو اس کی صفات کیسے ذاتی ہو سکتی ہیں؟ لہٰذا قرآنی مضامین میں مخلوق سے جس غیب کلی کے علم کی نفی کی گئی ہے اس میں ذاتی اور عطائی کی کج بحثی کی گنجائش نہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس غیب کے علم کی مخلوق سے نفی کی گئی ہے وہ اس معنی میں ہے کہ یہ اللہ کی ذات کے ساتھ

مخصوص ہے۔ یہ علم تفصیلی وکلی، محیط وبسیط ہے، اسی کو مفاتح الغیب (غیب کی کنجیاں) کہا گیا ہے۔ اور جن لاتعداد غیبی خبروں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو مطلع فرمایا ہے، یہ غیبی جزئیات ہیں۔ یہ غیب جزئی کا عطائی علم ہے، غیب کلی کا عطائی علم ہرگز نہیں۔ یہ بھی اس صورت میں درست ہے جب کہ طلاع علی الغیب اور اظہار علی الغیب کو علم الغیب کہنے پر اصرار کیا جائے ورنہ عطائی علم دراصل علم الغیب ہے ہی نہیں اسی معنی میں بعض مقدمین اہلِ علم اور مفسرین نے ذاتی اور عطائی کی بحث کی ہے۔ اس بحث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرات انبیا علیہم السلام اور اولیائے کرام کو غیب کلی کا علم دیا گیا ہے۔ اگر کسی نے ایسا سمجھا ہے تو عقلِ سلیم اور کتاب وسنت کی نصوص صریحہ (کھلی وضاحتوں) کی رو سے ایسا عقیدہ اور خیال باطل اور فریب نفس ہے۔ اگر کوئی زید کہے کہ فلاں گھر کے بہت سے افراد کا تو مجھے علم ہے لیکن میں اس گھرانے کے سب کے سب افراد سے باخبر نہیں ہوں اور کئی افراد ایسے بھی ہیں جن کا مجھے قطعاً کوئی علم نہیں، تو اس سے کلام میں قطعاً کوئی تعارض پیدا نہیں ہوتا۔ کسی شخص کے لئے یہ کہنا درست نہیں کہ ایسا کہنے سے کلام میں تعارض پیدا ہوتا ہے لہٰذا زید متعلقہ گھرانے کے سب کے سب افراد سے یقیناً باخبر ہوگا۔ یا پھر کسی سے بھی باخبر نہیں ہوگا۔ منطقی اصطلاح کے مطابق ایجاب جزئی، سلب کلی کی نقیض تو ہوسکتا ہے لیکن رفع ایجاب کلی کی نقیض نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے زید کو کسی کتاب کے بعض مضامین تو ازبر ہوں لیکن اس کتاب کے سارے کے سارے مضامین سے اس کا باخبر ہونا ضروری نہیں۔ یہاں کلام میں کسی طرح کا تعارض پیدا نہیں ہوتا کہ جھوٹی تاویلیں تراشی جائیں۔

۹۔ زید عدالت میں حلفیہ بیان دیتا ہے کہ میری کوئی جائداد نہیں، میں ایک مرلہ زمین کا بھی مالک نہیں۔ میری کوئی بیوی نہیں اور نہ ہی میرا کوئی بیٹا یا بیٹی ہے۔ اس کے مخالفین ثابت کر دیتے ہیں کہ زید مثلاً بیس ایکڑ اراضی کا مالک ہے، اس کا ایک مکان تو وہ ہے جس میں وہ خود رہائش پذیر ہے اور دوسرا مکان اس نے کرائے پر دے رکھا ہے۔ زید شادی شدہ ہے، اس کی دو بیویاں زندہ موجود ہیں اور اس کے ان سے آٹھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ زید جواب میں یوں وضاحت کرتا ہے کہ میں نے مکان، جائیداد اور بیوی بچوں کے نہ ہونے کا جو حلفیہ بیان دیا ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ میں از خود ذاتی طور پر کسی بھی چیز کا مالک نہیں۔ یہ دو مکان اور یہ بیس ایکڑ زمین اور یہ میرے بیٹے اور بیٹیاں جن کا حوالہ میرے مخالفین دے کر مجھے جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہیں، سب کے سب میرے اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں یعنی یہ سب کچھ عطائی ہے۔ میں کون ہوتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی عطائی نعمتوں کا انکار کروں۔ میں نے اپنے حلفیہ بیان میں جو کچھ لکھا ہے اسے ذاتی نفی پر محمول کیا جائے۔ کیا زید کی یہ وضاحت عدالت اور اس کے مخالفین بل کہ کسی

بھی سلیم الطبع شخص کو مطمئن کرے گی؟ کیا سب لوگ زید کو پرلے درجے کا دغاباز، مکار اور عیار قرار نہیں دیں گے؟ کیا قاضی یا جج زید کے لئے کوئی سخت سزا تجویز نہیں کرے گا یا اس کی ذہنی صحت پر شبہ نہیں کرے گا؟ اب اگر زید لوگوں کے غضب ناک تیور بھانپتے ہوئے یوں پینترا بدلے کہ میں سچا پکا مسلمان ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ اعلان فرمایا کرتے تھے **لا اعلم الغیب** کہ میں غیب نہیں جانتا، جب آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے **لا املك لكم ضرا ولا رشدا** کہ میں تمہارے نقصان اور نفع کا مالک نہیں ہوں، جب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم پر اعلان فرمایا کرتے تھے **لا ادری اقریب ماتوعدون اویجعل له ربی امدا**' کہ ''میں نہیں جانتا کہ جو (قیامت وغیرہ کا) وعدہ تم سے کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لئے دور کی مدت مقرر کرے گا، تو اس طرح کے تمام مضامین اور اعلانات میں آپ ﷺ صرف ذاتی علم اور ذاتی ملکیت کی نفی فرمایا کرتے تھے۔ میں نے بھی سنت رسول ﷺ کی پیروی میں عدالت کے روبہ رو اپنے حلفیہ بیان میں ذاتی اراضی، ذاتی مکان، ذاتی بیوی، ذاتی اولاد کی نفی کی تھی۔ عطائی اراضی، عطائی مکان، عطائی بیوی اور عطائی اولاد کی نفی ہرگز نہیں۔ کیا زید کا یہ بیان عدالت اور لوگوں کے لئے قابل قبول ہوگا یا اور زیادہ اُنہیں مشتعل کرے گا؟ اگر اس سے کہا جائے کہ تم نے اپنے بیان میں دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے تو وہ جواب میں یوں کہے کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ میں تمہارے نقصان ونفع کا مالک نہیں ہوں تو اس سے ضدی مخالفین کو ٹالنا مقصود ہوتا تھا اور کبھی آپ ﷺ اس طرح کے کلمات (خصوصاً مخالفین کے روبرو) محض تواضعاً فرمایا کرتے تھے۔ میں نے بھی (مزعومہ) سنت رسول ﷺ کی اتباع میں اپنے مخالفین کو ٹالنے کے لئے اور کچھ ازراہِ تواضع یہ کہا تھا کہ میری کوئی جائیداد نہیں، میری کوئی بیوی اور اولاد نہیں۔ کیا زید کی یہ وضاحت قاضی (جج) اور حاضرین کو مطمئن کرے گی؟ جس طرزِ عمل پر زید کو ایک عام شریف انسان بھی نہ سمجھا جاسکے، ایسے ہی طرزِ عمل کی نسبت شعوری یا غیر شعوری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف یا اس کے رسول کی طرف حُبِّ رسول ﷺ کی آڑ میں کر دینا فریب نفس تو نہیں؟ گر وہی وابستگی اور تعصب سے بالاتر ہو کر ٹھنڈے دل سے بار بار سوچے تو انشاء اللہ العزیز صحیح وغلط اور حق وباطل میں امتیاز میں کوئی دُشواری نہیں ہوگی۔

۱۰۔ بکر ایک شخص نے آج سے دس سال پہلے عدالت میں حلفیہ بیان دیا تھا کہ میری کوئی جائیداد اور بیوی بچے نہیں ہیں۔ دس سال کے بعد پھر عدالت میں اس سے بیان مطلوب ہے۔ اس مرتبہ بھی اس نے وہی پہلا بیان دہرا دیا۔ اس کے مخالفین نے ثابت کر دیا کہ واقعی دس سال قبل بکر کی جائیداد اور اہل وعیال

نہیں تھے مگر اب تو وہ (مثلاً) ایک کارخانے کا مالک ہے، شادی شدہ ہے۔ اس کی ایک بیوی اور دو بیٹے ہیں۔ جواب میں بکر یہ کہتا ہے کہ آج سے دس سال پہلے جو میں نے جائیداد اور بیوی بچوں کی نفی کی تھی تو اس وقت عطائی نعمتوں کی نفی مقصود تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت نہ مجھے کارخانہ دیا تھا۔ نہ ہی بیوی بچے دیئے تھے۔ میں اس دوران کوشش میں لگا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بہ تدریج مجھے روپیہ پیسہ عطا فرمایا۔ میں نے ایک کارخانہ خرید لیا۔ شادی بھی کر لی یوں اللہ نے مجھے بیوی بھی عطا فرما دی اور اس سے دو بیٹے بھی عطا فرما دیئے۔ میں نے اپنے موجودہ بیان میں جائیداد اور بیوی بچوں کی نفی کی ہے تو ذاتی جائیداد، ذاتی بیوی اور ذاتی بیٹوں کی نفی کی ہے۔ عطائی کی نفی مراد نہیں۔ میں پکا مسلمان ہوں۔ میرے بزرگوں نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرماتے تھے کہ میں غیب نہیں جانتا، میں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں تو آپ ﷺ واقعی عطائی علم غیب اور عطائی ملکیت کی نفی فرمایا کرتے تھے کیوں کہ اس وقت آپ ﷺ کو بہ تدریج علم غیب دیا جا رہا تھا، ابھی یہ مکمل نہیں ہوا تھا اسی لئے نزولِ قرآن کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ البتہ جب سارا قرآن آپ ﷺ پر نازل ہو چکا تو آپ مکمل طور پر عالم الغیب ہو گئے تھے۔ لیکن حضرت جابرؓ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی وفات سے صرف ایک مہینہ پہلے (یعنی صفر ۱۱ ہجری میں) یہ فرماتے سنا **تسئلونی عن الساعة وانما علمها عند الله** (۲۹/ ج) ''تم مجھ سے قیامت کا پوچھتے ہو اس کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے۔'' اس مرتبہ ہمارے بزرگوں کے کہنے کے مطابق آپ ﷺ نے قیامت کے وقتِ وقوع کے علم کی نفی فرمائی تو یہ نفی عطائی علم کی نہیں بل کہ ذاتی علم کی فرمائی تھی کیوں کہ آن کی مدت پوری ہونے پر آپ ﷺ عالم الغیب ہو گئے تھے اور قرآن کریم حجۃ الوداع کے ایام تک پورا نازل ہو چکا تھا۔ میں نے بھی (مزعومہ) سنت نبوی ﷺ کی پیروی میں آج سے دس سال پہلے عطائی جائیداد اور عطائی اہل وعیال کی نفی کی تھی، پھر بہ تدریج ان نعمتوں کے اسباب میرے لئے پیدا ہوتے چلے گئے۔ اب جب کہ مجھے یہ نعمتیں واقعی اللہ تعالیٰ نے عطا فرما رکھی ہیں تو میں نے اپنے حالیہ بیان میں ذاتی جائیداد اور ذاتی اہل وعیال کی نفی کی ہے، عطائی کی ہرگز نہیں کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عدالت اور میرے مخالفین میرے جذبہ حب رسول ﷺ کے پیش نظر نہ صرف مجھے بے قصور خیال فرمائیں گے بل کہ میرے طرزِ عمل کو مستحسن بھی قرار دیں گے۔ کیا بکر کا مذکورہ جواب معقول اور اطمینان بخش سمجھا جائے گا؟ ہرگز نہیں، بکر اور زید کی مذکورہ مثالوں میں جوابات اس لئے نا قابل قبول اور مردود ہوں گے کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی عطا کے بغیر کسی بھی چیز کا از خود یعنی ذاتی طور پر حاصل ہونا سراسر محال اور خلاف عقل ہونے کی بناء پر سرے سے خارج از بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کے متعلق یا مخلوق میں سے جب بھی کوئی اپنے آپ

سے یا لوگوں سے کسی چیز کے علم یا کسی چیز کی ملکیت کی نفی کرے گا تو سامع اور مخاطب کا ذہن لازماً عطائی علم اور عطائی ملکیت کی نفی کی طرف ہی منتقل ہوگا۔ مخلوق کے لئے ذاتی علم اور ذاتی ملکیت کا محال ہونا تو اسے پہلے ہی معلوم اور مُسلّم ہے۔ ہاں اگر متکلم تقیئے سے کام لیتا ہوا خلاف حقیقت بات کہے کہ دل میں کچھ اور ہو اور زبان پر کچھ اور ہو، یا توریہ سے کام لے رہا ہو کہ بات تو صحیح کہہ رہا ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ سامع اور مخاطب کچھ اور سمجھے تو الگ بات ہے۔ جہاں تک کسی خوف یا کسی طرح کے حقیقی یا وہمی اندیشے کی بنا پر تقیئے اور توریے سے کام لینے کا تعلق ہے تو دین کی تبلیغ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کا دامن اس سے قطعاً پاک اور ان کا مقام اس سے بہت بلند ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے کہ ''وہ (انبیاء) اللہ کے احکام (لوگوں کو) پہنچاتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے'' (۳۰/الف) اور سورۂ مائدہ میں ہے کہ ''اے پیغمبر! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اُتارا گیا ہے اسے تو (لوگوں تک) پہنچا دے اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو رسالت (کی ذمہ داری) تو نے ادا نہیں کی، اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔'' (۳۰/ب) مزاح لطیف کے طور پر کسی خبر میں پیغمبر کبھی کبھار اور شاذ و نادر توریہ سے کام بھی لے تو ناممکن ہے کہ ساتھ ہی وہ سامع اور مخاطب پر اصل حقیقت واضح نہ فرمائے یا خارجی حالات اور قرائن سے اصل حقیقت از خود واضح نہ ہو پائے۔ مثلاً حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے سواری کے لئے ایک اونٹ مرحمت فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تجھے سواری کے لئے اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ کہنے لگی کہ ہم اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (چھوٹا ہو یا بڑا ہر) اونٹ کو اونٹنیاں ہی تو جنتی ہیں۔ (۳۰/ج) اور مثلاً ازواج مطہرات کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس دنیا سے میرے رخصت ہونے کے بعد تم میں سے سب سے پہلے مجھ سے ملاقات وہ کرے گی (یعنی فوت ہوگی) جس کا ہاتھ تم میں سے سب سے لمبا ہوگا۔ ازواج مطہرات نے چھڑی سے اپنے ہاتھوں کی پیمائش شروع کر دی حضرت سودہؓ کا ہاتھ سب سے لمبا نکلا لیکن بعد میں جب ازواج مطہرات میں سے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا سب سے پہلے انتقال ہوا تو پتہ چلا کہ لمبے ہاتھ سے رسول ﷺ کا اشارہ سخاوت اور فیاضی کی طرف تھا۔ ہاتھ کی ظاہری لمبائی مراد نہ تھی (۳۰/د) کسی عدالت میں گواہ تقیئے اور توریے سے کام لے یا گواہی کو کسی بھی طریقے سے مشتبہ کرے تو اس سے صرف مدعی یا مدعا علیہ کا مفاد مجروح ہوگا۔ اگر اللہ کا رسول دین کی تبلیغ میں عموماً اور عقائد کی تعلیم میں خصوصاً تقیئے اور توریے سے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کام لے تو اس سے تو پوری اُمت کا مفاد خلل پذیر ہوگا۔ اگر اللہ کا رسول کفار کو ٹالنے کے لئے ان سے کچھ اور کہے اور مسلمانوں سے کچھ اور کہے تو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ایسی دورنگی سے تبلیغ کا حق کیسے ادا ہوگا اور

اللہ تعالیٰ کی طرف سے موافق ومخالف ہر کسی پر حجت کیسے پوری ہوگی؟ الغرض بکر اور زید کا مذکورہ مثالوں میں طرزِ عمل کسی دنیوی عدالت میں اُنہیں بری الذمہ قرار نہیں دے گا۔ اب اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف اس طرزِ عمل کو منسوب کر کے بہ زعم خویش اسے حب رسول قرار دے تو خوب غور کیجئے وہ بہ روزِ قیامت بھلا رب العالمین کی عدالت میں کیسے سرخ رو ہوگا؟

ب:۱۔ مذکورہ بالا مباحث سے یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ مخلوق میں سے جب بھی کوئی متکلم اپنے بارے میں کسی چیز کے علم کی نفی کرے گا تو ہر سامع اور مخاطب کا ذہن لازماً عطائی علم کی نفی کی جانب ہی منتقل ہوگا کیوں کہ مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا کے بغیر ایک ذرے کا علم بھی محال ہے۔ اس کے باوجود یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقل سلیم کے اس بدیہی فیصلے کی تائید وتوثیق خود رسول اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اور جلیل القدر صحابہ کرامؓ نے تفسیری اقوال سے فرمائی ہے یا نہیں تاکہ لوگوں پر ہر طرح سے حجت پوری ہو جائے؟ اگر فرمائی ہے تو یہی حق ہے۔ اگر کوئی انکار کرے تو اس کی بھرپور نفی آپ ﷺ کے ارشادات اور صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال سے ہوتی ہے۔ مفاتح الغیب (غیب کی کنجیوں) کے متعلق سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اُنہیں سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتہ ایسا نہیں جو اس کے علم کے بغیر گرتا ہو اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں ایسا نہیں اور کوئی تر یا خشک چیز ایسی نہیں جو کتاب مبین (لوح محفوظ) میں (درج) نہ ہو۔'' (۳۱/الف) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مفاتح الغیب یہ پانچ چیزیں ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ کے سوال کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا واقعات پیش آئیں گے، اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ بچہ دانیوں میں کیا ہے، اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ بارش کب ہوگی اور کسی کو پتہ نہیں کہ اس کی موت کس سرزمین میں ہوگی، کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب ہوگی؟ (۳۱/ب) مفاتح الغیب یا مذکورہ پانچ چیزوں کا ذکر قرآن کریم میں یوں ہے کہ'' بے شک اللہ کے پاس ہی قیامت کا علم ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہ جانتا ہے جو بچہ دانیوں میں ہے اور کوئی شخص (یقینی طور پر) نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص (یقین سے) نہیں جانتا کہ وہ کس علاقے میں مرے گا۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا (اور) پوری طرح باخبر ہے۔'' (۳۱/ج) غیب کی کنجیاں چوں کہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں۔ لہٰذا وہی اس معنی میں عالم الغیب ہے کہ جو چیز مخلوق سے پوشیدہ ہے وہ اللہ پر پوشیدہ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اوتیت مفاتیح کل شیء الا الخمس ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث (۳۲/الف) ''مجھے ان پانچ چیزوں

کے سوا ہر چیز کی چابیاں دی گئی ہیں پھر آپ ﷺ نے سورۂ لقمان کی آیت تلاوت فرمائی جن میں ان پانچ چیزوں کا ذکر ہے۔ حضرت ربعیؒ بن خراش سے روایت ہے کہ مجھے بنی عامر کے ایک شخص نے بتایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس علم سے کوئی ایسی چیز بھی باقی ہے جسے آپ نہ جانتے ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا علمنی الله خیراً وان میں العلم مالایعلمه الا الله عزوجل الخمس ان الله عنده علم الساعة وینزل الغیث ویلعم مافی الارحام (۳۲/ب) ''اللہ نے مجھے اچھائی کی خوب تعلیم دی ہے اور بے شک علوم میں سے وہ بھی ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ چناں چہ پانچ باتیں (جو سورۂ لقمان کی آخری آیت میں مذکور ہیں) ان کا پورا علم صرف اللہ کو ہے کسی دوسرے کو نہیں۔'' حضرت علیؓ بن ابی طالب مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں لم یعلم علی نبیکم صلی الله علیه وسلم الاالخمس من سرائرالغیب هذه الایة فی اٰخر اللقمان الی اخر السورة (۳۲/ج) ''تمہارے نبی پر اسرارِ غیب میں سے یہی پانچ چیزیں مخفی ہیں جو سورۂ لقمان کی آخری آیت میں مذکور ہیں۔'' حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں اوتی نبیکم صلی الله علیه وسلم مفاتیح کل شیء غیرالخمس (۳۳/الف) ''تمہارے نبی ﷺ کو ان پانچ چیزوں کے سوا ہر چیز کی چابیاں دی گئی ہیں۔'' حضرت قتادہؒ تابعی فرماتے ہیں کہ ''غیب کی ان پانچ چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خاص کرلیا ہے قلم یطلع علیهن ملکا مقربا ولا نبیا مرسلا (۳۳/ب)'' تو ان پر نہ تو اس نے کسی مقرب فرشتے کو اور نہ ہی کسی نبی مرسل کو مطلع فرمایا ہے۔'' پس مخلوق کو ان علوم خمسہ میں سے جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ غیب کی کنجیاں یا غیب کے اصول نہیں بل کہ اطلاع علی الغیب کے طور پر صرف غیبی جزئیات پر مطلع کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ مخلوق کے علم کے اعتبار سے بے حد وحساب ہی کیوں نہ ہوں لیکن بہ ہر حال یہ غیب کلی پر اطلاع نہیں بل کہ غیب جزئی پر اطلاع ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام صاحب وحی ہوتے ہیں۔ اُنہیں غیبی جزئیات پر جو اطلاع دی جاتی ہے تو یہ اطلاع یقینی اور قطعی ہوتی ہے۔ اسی لئے بعض اہل علم مثلاً علامہ قرطبیؒ نے کہا ہے کہ ایسی غیبی خبریں (جو دین سے متعلق ہوتی ہیں) اگر ان کی سند رسول اللہ ﷺ تک نہ پہنچے تو ان کا صحیح ہونا یقینی نہیں۔ ان حضرات کی اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ مفاتیح الغیب کو تفصیلاً یعنی ہر وقت ہر ہر جزئی کو جانتے ہیں اور آپ ﷺ عالم جمیع ماکان ومایکون ہیں۔ جن غیبی جزئیات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مطلع فرمایا ہے خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں، ان کا حوالہ دے کر پیغمبروں کے لئے غیب کلی پر استدلال دعویٰ کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے صریحاً اور قطعاً غلط ہے۔ حیرت ہے کہ دعویٰ تو غیب کلی کے علم کا ہو اور دلیل میں غیبی جزئیات پیش کردی جائیں۔ الغرض رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور

حضرت قتادہؒ جیسے تابعین سے اس کی کھلی وضاحت مل گئی کہ کسی کو بھی حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی ان امور خمسہ کا علم نہیں دیا گیا۔ ذاتی اور عطائی کی آڑ میں کسی تاویل اور تحریف کی گنجائش تو پہلے بھی نہیں تھی اب تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کی زبانی اس پر مزید مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔

ان امور خمسہ پر غور کیجئے جب کسی کو قیامت کا علم نہیں تو قیامت کے دن جنت یا جہنم میں جانے والے ہر شخص کو کن مراحل سے گزرنا پڑے گا، اس کا تفصیلی علم بھی ہرگز کسی کو نہیں ہے۔ عبور صراط، میزان اعمال وغیرہ مراحل کا مجموعی اور اجمالی علم تو لوگوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعے دیا گیا لیکن ہر شخص کے متعلق فرداً فرداً تفصیلی علم کسی کو نہیں دیا گیا۔ بارش اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے، قیامت تک یہ بارش کن کن علاقوں میں اور کتنی ہوتی رہے گی، کن فصلوں کو فائدہ پہنچائے گی اور کہاں کہاں اس کا نقصان ہوگا، کون کون سی فصلیں، پودے، پھل اور پھول کون سی بارش سے کہاں کہاں اور کتنی مقدار میں پیدا ہوں گے، کون کون سی اور کتنی اجناس اس سے پیدا ہوں گی، کون کون سے انسانوں اور دیگر حیوانات کی غذا بنیں گی وغیرہ لاتعداد امور کا تفصیلی علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ ماں کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ، پیدا ہونے والا بچہ سعید و نیک بخت ہوگا یا شقی و بد بخت، وہ کہاں اور کب مرے گا وغیرہ۔ لاتعداد امور کا علم اللہ کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ کوئی شخص بھی یقین سے نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اس کے منصوبے اور عزائم پورے ہوں گے یا نہیں، اس کا یقینی علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ کوئی شخص کہاں مرے گا، اس کا یقینی علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ خالق نے تو ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے لیکن مخلوق کے لئے یہ سب امور لاتعداد اور بے حد و حساب ہیں۔ ان میں سے ہزاروں بل کہ لاکھوں کروڑوں چیزوں کا علم مخلوق کو دے بھی دیا جائے تو بھی یہ علم بہ ہر حال جزئی اور محدود علم ہے۔ کلی اور تفصیلی ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار غیبی جزئیات پر انبیاء علیہم السلام کو مطلع فرمایا ہے۔ ساری شریعت اطلاع علی الغیب ہی ہے۔ قصص و واقعات اس کے ماسوا ہیں۔ قرآن کریم کی وجوہ اعجاز میں نمایاں ترین وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس میں امم سابقہ، نزول قرآن کے زمانے اور مستقبل کی بہت سی خبریں دی گئی ہیں جنہیں قطعاً غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم جو کچھ بھی دیا گیا ہے، غیبی جزئیات کا عطائی علم ہے، یہ علم محیط اور علم تفصیلی ہرگز نہیں ہے۔ لہٰذا ان غیبی جزئیات کو علم محیط اور علم تفصیلی دیئے جانے پر بہ طور استدلال پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔

۲۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا معتبر مفسرین نے بھی مخلوق کو حتیٰ کہ سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کو بھی غیب کلی کا علم عطا کئے جانے کی صاف صاف الفاظ میں نفی فرمائی ہے یا نہیں تاکہ ذاتی اور عطائی کی فرسودہ تاویل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے انجام کو پہنچ جائے؟ اگر فرمائی ہے تو یہی حق ہے۔ اگر کہا

جائے کہ ایسی کوئی وضاحت ان سے منقول نہیں تو سنئے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ ''یہ لوگ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ اس کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے۔ اسے اس کے وقت پر صرف وہی ظاہر کرے گا۔ (یہ قیامت) آسمانوں اور زمین میں ایک بھاری چیز ہے، یہ تم پر اچانک ہی آپڑے گی۔ یہ تجھ سے (یوں) پوچھتے ہیں گویا تو اس کی تلاش (اور تحقیق) میں لگا ہوا ہے' قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ (۳۳/ ج) ''تو کہہ دے کہ اس کا علم صرف میرے رب کو ہے لیکن اکثر لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ یہاں اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَاللّٰهِ کے بارے میں تفسیر ابوالسعود میں ہے انه تعالیٰ قد استأثر به بحیث لم یخبر به احدا من ملك مقرب و نبی مرسل اور یہی عبارت تفسیر مدارک التنزیل کی بھی ہے (۳۴/ الف) ''اللہ تعالیٰ نے اس کا علم اپنی ذات کے ساتھ مخصوص فرمالیا ہے اس نے اس کی خبر کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کو نہیں دی۔'' تفسیر بیضاوی میں ہے استأثر به لم یطلع علیه ملکا مقربا ولا نبیا مرسلا (۳۴/ ب) ''قیامت کے علم کو اللہ نے اپنے لئے خاص کرلیا ہے اس (کے ٹھیک وقت) کی اطلاع اس نے کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کو نہیں دی'' سورۂ احزاب میں ہے ''لوگ تجھ سے قیامت کا پوچھتے ہیں' قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَاللّٰهِ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا (۳۴/ ج) ''تو کہہ دے کہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے اور (اے پیغمبر!) تجھے کیا خبر شاید قیامت قریب ہی آپہنچی ہو''۔ اس آیت میں بھی اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَاللّٰهِ کی تفسیر میں علامہ علیؒ بن محمد خازن اپنی تفسیر لباب التنزیل میں لکھتے ہیں ان الله تعالیٰ قد استأثر به ولم یطلع علیه نبیا ولا ملکا۔ تفسیر بیضاوی میں ہے لم یطلع علیها ملکا ولا نبیا۔ تفسیر ابوالسعود میں ہے قد استأثر به ولم یطلع علیه نبیا ولا ملکا۔ علامہ معینؒ بن صفی کی تفسیر جامع البیان میں ہے۔ لم یطلع علیه احدا۔ (۳۵/ الف) مذکورہ بالا تمام تفسیری عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خاص کرلیا ہے اور اس نے اس کی اطلاع کسی فرشتے یا نبی کو بھی نہیں دی۔ سورۂ ملک میں ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ (قیامت یا غلبہ اسلام وغیرہ کا) یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَاللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۳۵/ ب) ''تو کہہ دے کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے میں تو صاف آگاہ کرنے والا ہوں۔'' آیت میں اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَاللّٰهِ کی تفسیر میں علامہ ابوالسعود لکھتے ہیں ای العلم بوقت مجیٔ الساعة عنده عزوجل لایطلع علیه غیره۔ (۳۵/ ج) یعنی ''قیامت کے آنے کے وقت کا علم اللہ عزوجل ہی کے پاس ہے اس پر وہ کسی کو مطلع نہیں کرے گا۔'' سورۂ یونس میں ہے کہ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ تو کہہ دے کہ میں اپنی جان کے لئے بھی کسی نقصان اور نفع

کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے۔'' (۳۶/ الف) ابن کثیرؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں وقد اخبرتکم بمجیئ الساعۃ وانہا کائنۃ ولم یطلمنی علیٰ وقتہا (۳۶/ ب)'' اور بے شک میں تمہیں قیامت کے آنے کی خبر دے چکا ہوں اور بے شک وہ آکر رہے گی''۔ اس نے مجھے اس کے وقت پر مطلع نہیں فرمایا ہے۔'' سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ'' وہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ (قیامت کا وقت) کب ہے؟ تو کہہ دے ممکن ہے قریب ہی ہو۔'' (۳۶/ ج) امام رازیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں انہ لا یطلع احدا من الخلق علی الوقت المعین۔'' (۳۷/ الف)'' بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) مخلوق میں سے کسی کو بھی (اس قیامت کے) معینہ وقت کی اطلاع نہیں دے گا۔'' سورۂ انبیاء میں ہے کہ تو کہہ دے کہ میری طرف یہی وحی کیا جاتا ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم فرماں برداری کرتے ہو؟ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو میں نے تم کو یک ساں طور پر خبردار کر دیا ہے (یہ نہیں کہ مخالفین سے کچھ اور کہوں اور اپنے ساتھیوں سے کوئی اور بات کروں یہاں دورنگی نہیں چلتی) مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز (قیامت وغیرہ) کا وعدہ تم سے کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا دور۔ (۳۷/ ب) اس کی تفسیر میں علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں ای لا ادری متیٰ یکون یوم القیامۃ لان اللہ تعالیٰ لم یطلعنی علیہ ولا ادری متی یحل بکم العذاب ان لم تؤمنوا۔ (۳۷/ ج)'' یعنی میں نہیں جانتا کہ قیامت کا دن کب ہوگا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر مطلع نہیں فرمایا اور میں نہیں جانتا کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ تو تم پر عذاب کب نازل ہوگا؟'' سورۂ نازعات میں ہے کہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ تیرا اس کے ذکر سے کیا تعلق؟ تیرے رب کی طرف اس (کے علم) کی انتہا ہے جو اس قیامت سے ڈرے تو اسے ڈرانے والا ہے (۳۸/ الف) تفسیر ابوالسعود میں ہے وانّی لک ذالک وھو مما استأثر بہ علام الغیوب (۳۸/ ب)'' کہاں تو اور کہاں یہ (قیامت کے وقت کا علم)! یہ تو ان چیزوں میں سے ہے جن (کے علم) کو علام الغیوب اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص فرمالیا ہے۔'' امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں اور خطیب شربینیؒ نے اپنی تفسیر السراج المنیر میں لکھا ہے لم یؤت علمہا احدا من خلقہ (۳۸/ ج)'' اس (اللہ) نے اس (قیامت) کا علم اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں دیا۔''

۳۔ سورۂ مومن میں ہے کہ'' ہم نے تجھ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے احوال ہم نے تجھ سے بیان کئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تجھ پر بیان نہیں کئے۔'' (۳۹/ الف) اور سورۂ نساء میں ہے کہ کئی رسولوں کے حالات ہم نے تجھے بیان کئے ہیں اور کئی رسولوں کے ہم نے تجھے بیان نہیں کئے۔'' (۳۹/ ب) پہلی متعلقہ آیت مکی سورت کی اور دوسری متعلقہ آیت مدنی

سورت کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ غزوۂ خیبر کے ایام میں جمادی الاولیٰ ۷ ہجری قمری میں مسلمان ہوئے تھے ان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **ما اوری تبعا أنبیا کان ام لا وما ادری أذالقرنین کان نبیاً ام لا وما ادری الحدود کفارات لاھلھا ام لا**۔(۳۹/ج) ''میں نہیں جانتا کہ تبع نبی تھے یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی تھے یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ (دنیا میں مجرموں پر جاری کردہ) حدود ان کے لئے کفارہ ہو جائیں گی یا نہیں؟'' تبع اور ذوالقرنین کے اگرچہ کچھ حالات قرآن کریم میں مذکور ہیں لیکن وہ نبی تھے یا نہیں، اس کا علم خود رسول اللہ ﷺ کو بھی نہیں دیا گیا۔ یہاں صرف ذاتی علم کی نفی اس لئے مراد نہیں لی جاسکتی کہ ذاتی علم تو آپ ﷺ کو کسی بھی نبی کا نہیں تھا، سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آپ ﷺ بتایا گیا تھا تو پھر تبع اور ذوالقرنین کی تخصیص ہی کیا معنی رکھتی ہے؟ پس جن بے شمار انبیاء علیہم السلام کا ذکر قرآن کریم میں سرے سے ہے ہی نہیں، آپ ﷺ ان کے حالات سے بھی بے خبر تھے اجمالاً ان کی تعداد وغیرہ بیان کردی جائے تو الگ بات ہے گو تعداد کے متعلق بھی بہ لحاظ سند صحیح احادیث موجود نہیں ہیں یہ سمجھ لینا درست نہیں کہ جن پیغمبروں کے حالات قرآن کریم میں مذکور نہیں تو لازماً وحی خفی کے ذریعے آپ ﷺ کو ان پر مطلع کردیا گیا ہوگا، ورنہ آپ تبع اور ذوالقرنین کے متعلق بھی تفصیلی علم ضرور رکھتے اور یہ نہ فرماتے کہ مجھے ان کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا علم نہیں ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہونے سے استغراق حقیقی مراد نہیں ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کے غیب کلی جاننے پر استدلال کیا جاسکے، ورنہ سب کے سب پیغمبروں کے حالات ضرور بالضرور قرآن کریم میں مذکور ہوتے اور اعتقادی لغزشوں میں مبتلا ہمارے بھائیوں کو اس (فاسد) تاویل کا سہارا لینے پر مجبور نہ ہونا پڑتا کہ جن پیغمبروں کے حالات قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں وہ بہ قول ان حضرات کے وحی خفی کے ذریعے آپ ﷺ کو بتائے گئے تھے۔

۴۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى** (۴۰/الف) ''بے شک قیامت آنے والی ہے میں اسے مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو اس کی (اچھی یا بری) کمائی کا بدلہ دیا جائے۔'' حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں **ای لا اظھر علیھا احدا غیری** (۴۰/ب) ''یعنی میں اسے اپنے سوا کسی اور پر ظاہر نہیں کروں گا۔'' یعنی جب اس کا وقت ظاہر ہوگا سو ہوگا جیسا کہ آیت کے ابتدائی حصے سے واضح ہے کہ قیامت آنے والی ہے لیکن اس کے ظہور سے پہلے تک اللہ تعالیٰ نے اسے مخلوق سے مخفی رکھنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ مستقبل میں اگر اس پر اللہ تعالیٰ کسی بھی مخلوق کو مطلع فرمادے تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے (معاذ اللہ) اپنے قول کی خلاف

ورزی فرمائی۔ سورۂ اعراف میں قیامت کے متعلق ہے کہ ''(اے پیغمبر) تو کہہ دے اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ (۴۰/ج) ''اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔'' اس کی تفسیر میں بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں انما علمها عنده ویستأثر یعلمها معلم یطلع علیها ملکا ولا رسولا۔ (۴۱/الف) ''اس کا علم صرف اسی (اللہ) کے پاس ہے اور اس نے اس کے علم کو اپنے لئے خاص کر لیا ہے تو اس نے اس پر کسی بھی فرشتے کو اور نہ ہی کسی رسول کو مطلع کیا ہے۔'' سورۂ نمل میں ہے کہ ''تو کہہ دے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں ان میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا غیب نہیں جانتا'' وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۴۱/ب) ''اور لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ کب وہ (دوبارہ زندہ کر کے) اُٹھائے جائیں گے۔'' لوگوں کو ایسا علم دیا گیا ہوتا تو اس عطائی علم سے اُنہیں اپنے دوبارہ زندہ ہونے اور قیامت کے وقوع کے صحیح وقت کا علم ضرور بالضرور ہوتا اور اس سے تو کسی کو بھی ہرگز اختلاف نہیں کہ لوگوں کو اپنے دوبارہ زندہ کئے جانے کے ٹھیک وقت کا علم عطا نہیں کیا گیا ہے۔ پس جب آیت کے آخری حصے میں مخلوق سے عطائی علم کی نفی کی گئی ہے تو اس کے ابتدائی حصے سے بھی مخلوق سے عطائی علم کی نفی بہ طریق اولیٰ مراد ہے ورنہ ابتدائی حصے سے ذاتی علم اور آخری حصے سے عطائی علم کی نفی مراد لینا قرآن کریم کی خاصی مضحکہ خیز معنوی تحریف ہے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ ''تو (لوگوں سے) کہہ دے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب جانتا ہوں اور نہ ہی میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔'' (۴۱/ج) یہاں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو اعلان فرمایا ہے کہ میں فرشتہ نہیں ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں ذاتی طور پر خود بخود فرشتہ نہیں بن گیا ہوں بل کہ مجھے اللہ نے فرشتہ بنایا ہے۔ تمام ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کے اعتراف میں اُنہیں بہ حکم الٰہی سجدۂ تعظیمی کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ تو بہ طریق اولیٰ تمام ملائکہ سے افضل ہیں۔ پس مذکورہ قرآنی مضمون کا یہ مطلب لینا کہ آپ ﷺ کو فرشتہ ہونے کی صفت عطا فرمائی گئی ہے اور نفی عطائی کی نہیں بل کہ ذاتی کی ہے، آپ ﷺ کی سخت توہین ہے۔ جب متعلقہ آیت کے آخری حصے میں عطائی کی نفی لازماً مراد ہے تو ابتدائی حصے میں لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں'' اور وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ میں غیب نہیں جاننا کے کلمات میں بھی عطائی خزانوں اور عطائی علم غیب کی نفی تو بہ طریق اولیٰ مراد ہے۔ یہاں کسی معنوی تحریف کی قطعاً گنجائش اس لئے بھی نہیں کہ سابقہ سطور میں رسول اللہ ﷺ کی واضح احادیث، صحابہ کرامؓ کے غیر فہم آثار اور مفسرین کے معتبر تفسیری اقوال سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ مفاتیح الغیب کسی بھی مخلوق کو حتیٰ کہ سیّد المرسلین کو بھی نہیں دی گئیں، لہٰذا کسی بھی فاسد تاویل کو خاطر میں نہیں لایا

جاسکتا۔ اور اس طرح کے تمام قرآنی مضامین میں عطائی علم اور عطائی ملکیت کی نفی کی طرف ہی ذہن کو لازماً منتقل ہونا چاہئے کہ مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا کے بغیر ذاتی علم اور ذاتی ملکیت سرے سے محال اور قطعاً خارج از بحث ہے، جیسا کہ قبل ازیں بارہا بیان کیا جاچکا ہے اور زید اور بکر کی مثالوں سے سمجھایا بھی جاچکا ہے۔ یہ احادیث رسول ﷺ، آثار صحابہ اور اقوال مفسرین تو اس پر مستزاد ہیں۔ سورہ حٰمٓ السجدہ میں ہے کہ ''قیامت کا علم اللہ ہی کی طرف لوٹایا جاتا ہے اور جو بھی پھل اپنے شگوفوں سے نکلتے ہیں اور جو بھی مادہ حاملہ ہوتی ہے، سب کا اسے علم ہے۔'' (۴۲/ الف) سورۂ زخرف میں ہے کہ اسی (اللہ) کے پاس قیامت کا علم ہے اور ''اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔'' (۴۲/ ب) سورہ ہود میں ہے کہ ''آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ ﷻ کے پاس ہے اور تمام معاملات کا رجوع بھی اسی کی طرف ہے۔'' (۴۲/ ج) سورہ نحل میں ہے کہ ''آسمانوں اور زمین کا غیب کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور قیامت کا معاملہ تو ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بل کہ اس سے بھی زیادہ قریب، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (۴۳/ الف) سورہ کہف میں ہے کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم اسی (اللہ) کو ہے، اس کا دیکھنا کیسا ہی عمدہ دیکھنا اور اس کا سننا کیسا ہی عمدہ سننا ہے۔ (۴۳/ ب) مذکورہ مضامین پر مشتمل آیات کے شروع ہی میں لَهٗ، عِنْدَهٗ، لِلّٰهِ، اِلَيْهِ جیسے کلمات لاکر کلام میں حصر پیدا کردیا گیا ہے کہ غیب کا علم اور قیامت کا علم مخلوق کے پاس نہیں، صرف اور صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔

ان تمام مباحث سے عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مفاتح الغیب یا امور خمسہ کا ہمہ وقتی کلی و تفصیلی علم عطا نہیں فرمایا ہے البتہ ان امور خمسہ کی لاتعداد جزئیات پر اپنی مخلوق کو ضرور مطلع فرمایا ہے۔ چناں چہ سورہ جن میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز (وقوع قیامت اور ہزیمت کفر وغیرہ) کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کی کوئی (دور کی) مدت مقرر کرے گا۔ وہ غیب کا جاننے والا ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس پیغمبر کے جسے وہ (غیب کی خاص خبروں پر مطلع کرنے کے لئے) پسند کرلے بے شک اس کے آگے پیچھے وہ پہرے دار مقرر کردیتا ہے، تاکہ وہ (ظاہر میں بھی) جان لے کہ اُنہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے اللہ نے ان کے آس پاس کی سب چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے اور ہر ایک چیز کو شمار کر رکھا ہے۔'' (۴۳/ ج) اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے خاتم الانبیا حضرت محمد ﷺ کو بھی غیب کلی کا علم نہیں دیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمات نہ نکلواتا کہ مجھے علم نہیں کہ تمہارے ساتھ کئے گئے وعدے جلد پورے ہوں گے یا اُن میں کچھ وقت لگے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو کسی چیز سے تفصیلاً باخبر کرکے

(معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اس سے اداکاری نہیں کرواتا کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے علم کا انکار کردے۔ عقائد کی تعلیم اور دین کی تبلیغ کے سلسلے میں پیغمبر کافروں اور مسلمانوں کے سامنے (معاذ اللہ) دورنگی اختیار نہیں فرماتا کہ کافروں سے تو کہے میں نہیں جانتا اور مسلمانوں سے کہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ عقائد کی حیثیت (معاذ اللہ) ان اسرار کی نہیں ہے جو اپنوں پر ظاہر کئے جائیں اور غیروں سے چھپائے جائیں، لہٰذا یہاں یہ تاویل لچر بل کہ مضحکہ خیز ہے کہ اس انکار سے آپ کا مقصد کفار کو ٹالنا تھا۔ ساری وحی خواہ جلی ہو یا خفی، ساری شریعت غیب ہی ہوتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء علیہم السلام کو مطلع فرماتا ہے۔ یہ غیب جزئی پر اطلاع ہے، غیب کلی پر نہیں ورنہ سورہ جن تو مکی سورت ہے۔ اگر اس کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ عالم جمیع ماکان وما یکون ہو گئے تھے تو بعد میں ایک بھی آیت کے نزول کی ضرورت نہ تھی۔ اگر اس سے ناحق یہ مراد لیا جائے کہ مکمل نزول قرآن کے بعد آپ کو غیب کلی کا علم عطا ہو جائے گا تو گویا دلیل کئی برس پہلے نازل ہوگئی اور مدلول یعنی غیب کلی کا حصول کئی برس کے بعد ہوا۔ اسی لئے تمام معتبر مفسرین نے سورہ جن کے متعلقہ مضمون سے بعض غیوب پر اطلاع مراد لی ہے نہ کہ غیب کلی پر۔ آیت کا آخری حصہ بھی واضح کر رہا ہے کہ یہاں اظہار علی الغیب سے نزول وحی مراد ہے اور وحی کو اللہ کے فرشتے نہایت اہتمام اور حفاظت سے پیغمبر تک پہنچاتے ہیں۔ فکری اور اعتقادی لغزشوں میں مبتلا حضرات دو تفاسیر روح البیان اور تفسیر صاوی کا بہ کثرت حوالہ دیا کرتے ہیں، کیوں کہ ان میں غلو آمیز باتیں پائی جاتی ہیں لیکن قرآن کریم کی اعجازی شان دیکھئے کہ تفسیر روح البیان میں اس آیت کے متعلق لکھا ہے **ای الا رسول ارتضاہ و اختارہ لاظہارہ علیٰ بعض غیوبہ المتعلقہ ہر سالتہ**۔ یعنی ''مگر وہ رسول جسے اللہ نے پسند کرلیا ہو اور چن لیا ہو تاکہ اسے بعض ایسے غیوب پر مطلع کرے جن کا تعلق رسالت سے ہے۔'' اور تفسیر صاوی میں ہے **الا رسولاً ارتضاہ لاظہارہ علی** بعض غیوبہ یعنی ''مگر وہ رسول جسے اللہ نے بعض غیوب پر مطلع کرنے کے لئے پسند کرلیا ہو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں مفسرین بھی اپنے غلو آمیز خیالات کے باوجود رسول اللہ ﷺ کو عالم جمیع ماکان وما یکون نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو قیامت کے ٹھیک وقت کا علم عطا فرمایا ہوتا تو یہ عطائی علم بھی لوگوں کو مطمئن کرنے یا کم از کم ان کو صحیح جواب دینے کے لئے کافی ہوتا۔ اگر یہ علم لوگوں کے لئے مناسب نہ ہو تو صاف صاف کہا جا سکتا تھا کہ مجھے تو بہ خوبی علم ہے لیکن یہ علم مجھے تم سے پوشیدہ رکھنے کا حکم ہے۔ اس صورت میں آپ کی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ یہ اعلان کرواتا کہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ یہ اعلان ہرگز نہ کراتا کہ میں جانتا ہی نہیں۔ قبل ازیں ان مباحث میں یہ بھی اچھی طرح واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر سب پیغمبروں کے لئے غیب کلی کا علم تسلیم کیا جائے تو

سب کے علم میں مساوات لازم آئے گی۔ باہم ان کے علم میں رتی بھر کی بھی کمی اور بیشی نہیں ہوگی، حال آں کہ رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے اور حضرت محمد ﷺ تو سب کے سردار ہیں۔ اس غلط عقیدے سے آپ کی خصوصاً اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی عموماً جو توہین لازم آتی ہے اس سے نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ تفسیر روح البیان اور تفسیر صاوی کے مفسرین ہی کی یہ بات مان لی جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو سب کے سب غیوب پر مطلع نہیں فرماتا بل کہ بعض غیوب پر ہی مطلع فرماتا ہے اور جن علوم میں اللہ تعالیٰ سے قرب کا تعلق ہے، ان میں سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ کا مخلوق میں کوئی بھی شریک وسہیم نہیں ہے۔ یوں لامحالہ سورہ جن کی زیر بحث آیت سے اظہار علیٰ بعض الغیوب ہی مراد لیا جائے گا جیسا کہ آیت کے مضمون کا سیاق وسباق بھی علیٰ وجہ الکمال اسی کی بھرپور تائید توثیق کر رہا ہے۔

سورہ آل عمران میں ہے کہ ''اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ مومنین کو اسی حال پر چھوڑے رکھے جس پر تم اب ہو جب تک وہ گندے (منافق) کو پاکیزہ (مومن) سے (غزوہ احد جیسی آزمائشوں کے ذریعے) الگ تھلگ نہ کردے اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہیں غیب پر مطلع کردے بل کہ اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے (خاص) غیب پر مطلع کرنے کے لئے چن لیتا ہے اس لئے تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے لئے بڑا بھاری اجر ہے'' (۴۴/ الف)۔ اس قرآنی مضمون کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو یا کسی بھی اور پیغمبر کو غیب کلی کا علم دیا ہے۔ سورہ آل عمران کے ان مضامین کا تعلق شوال ۳ ہجری قمریہ شمسی میں پیش آنے والے غزوۂ احد سے ہے، جس میں مسلمانوں کا خاصا جانی نقصان ہوا تھا۔ غزوہ تبوک اس سے چھ سال بعد ہوا۔ اگر سورۂ آل عمران کے مذکورہ مضموم کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ عالم الغیب اور حاضر وناظر ہو گئے تھے تو غزوہ تبوک کے موقع پر جھوٹے بہانے بنانے والے منافقین اور اسی طرح مسجد ضرار بنانے والے منافقین کو آپ ﷺ ضرور پہچان لیتے اور بہ ذریعہ وحی آپ کے مطلع کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی بل کہ اس مفروضے کے صحیح ہونے کی صورت میں آپ ﷺ اس آیت کے نزول کے ساتھ ہی منافقین سے پوری طرح باخبر ہو جاتے او اللہ تعالیٰ کے اس قول کی ضرورت ہی نہ باقی رہتی کہ وہ پاکیزہ (مسلمانوں) کو گندے (منافقین) سے الگ کر کے رہے گا، بل کہ اس کے بعد آپ ﷺ پر کسی ایک آیت کے نزول کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ پس متعلقہ قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ سخت آزمائش کے موقع پر بہت سے منافقین کا نفاق ان کے قول اور فعل سے ظاہر ہو جائے گا۔ جیسا کہ غزوۂ احد، غزوۂ احزاب اور غزوۂ تبوک جیسی آزمائش کے مواقع پر اس کا بہ خوبی تجربہ ہو گیا، لیکن اگر کسی منافق کا نفاق کسی وجہ سے ایسے مواقع پر بھی ظاہر نہ ہو سکے تو

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ بہ ذریعہ وحی اس کے نفاق پر مطلع کر دے گا۔ وحی کے ذریعے اطلاع میں خطا کا قطعاً کوئی احتمال ہی نہیں جب کہ دوسروں کو کوئی غیبی خبر معلوم ہو بھی جائے تو اس میں خطا کا احتمال موجود رہے گا۔ پیغمبر کے بعد کوئی بھی معصوم عن الخطاء نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کے خلاف جہاد (خواہ لسانی ہی ہو) کا حکم اللہ تعالیٰ نے صرف اور صرف اپنے نبی کو دیا ہے، عام مسلمانوں کو نہیں۔ سورہ توبہ اور سورہ تحریم میں ہے کہ ''اے نبی! تو کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر۔'' (۴۴/ب) پیغمبر کے علاوہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کو منافق قرار دے مگر یہ کوئی منافق اپنے قول و فعل سے خود ہی اپنے نفاق کو ظاہر کر دے، چناں چہ سورۂ محمد میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو ان (منافقین) کو (آزمائش وغیرہ کے موقع پر) ان کے انداز کلام سے ہی خوب پہچان لیا کرے گا۔'' (۴۴/ج) عالم الغیب اور حاضر و ناظر کسی کو پہچاننے کے لئے اس کی کسی ظاہری علامت اور اس کے انداز کلام کا ہرگز محتاج نہیں ہوا کرتا۔ وہ تو اپنے ہر مخاطب کے ظاہر و باطن سے پہلے ہی پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ سورۂ محمد پہلے نازل ہوئی اور سورۂ توبہ غزوۂ تبوک کے زمانے کی ہے اور یہ وہ قرآن کریم کی آخری سورتوں میں سے ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمہارے اردگرد کے گنواروں میں منافقین بھی ہیں اور مدینے والوں میں سے بھی کچھ ایسے ہیں جو نفاق پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تو انہیں نہیں جانتا، ہم انہیں جانتے ہیں۔'' (۴۵/الف) سورۂ آل عمران یا سورۂ محمد کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ عالم جمیع ما کان و ما یکون اور حاضر و ناظر ہو گئے ہوتے تو غزوۂ تبوک کے منافقین کو پہچان لیتے۔ اس لئے جن حضرات نے سورۂ توبہ کی متعلقہ آیات کو منسوخ اور سورۂ محمد کی آیت کو ناسخ قرار دیا ہے ان کی عقل و دانش اور فہم و بصیرت پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ناسخ آیت پہلے نازل ہو گئی اور سورۂ توبہ کی منسوخ آیت بعد میں نازل ہوئی۔ پھر جس مقصد کے لئے یہ کھینچا تانی کی گئی ہے وہ پھر بھی حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ سورۂ محمد میں تو یہ کہا گیا ہے کہ پیغمبر ﷺ منافقین کو ان کی گفتگو کے ڈھب سے پہچان لیا کریں گے۔ بھلا عالم الغیب اور حاضر و ناظر کسی کو پہچاننے کے لئے اس کی گفتگو یا ظاہری علامت کا محتاج کیوں کر ہو گا وہ تو ہر کسی کے ظاہر و باطن سے پہلے ہی باخبر ہو گا۔ پس سورۂ آل عمران کی زیر بحث متعلقہ آیت کے مضمون میں اطلاع علی الغیب سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے نفاق کو اپنے پیغمبر پر بہ ذریعہ وحی بھی کھول سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنے پیغمبروں کو بہت سی غیبی جزئیات پر مطلع کیا کرتا ہے۔ اس سے غیب کلی پر نہیں بل کہ غیب جزئی پر ہی اطلاع مراد ہے۔ جیسا کہ متعلقہ آیت کے سیاق و سباق سے بھی بہ خوبی واضح ہے۔ اور تمام معتبر مفسرین نے بھی یہاں بعض غیوب پر ہی اطلاع مراد لی ہے۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے جسے ''حدیث جبرئیل'' کہا جاتا ہے۔ آپ کی عمر مبارک کے آخری حصے میں حضرت جبرئیل ایک نو وارد اعرابی کی صورت میں انسانی لبادے میں صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اہم دینی امور کے متعلق آپ ﷺ سے سوال و جواب کا آغاز کیا۔ جب حضرت جبرئیل نے آپ سے قیامت کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ **ماالمسئول عنه با علم من السائل** کہ جس سے پوچھا جارہا ہے وہ پوچھنے والے سے اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ یعنی قیامت کے وقوع کے وقت پر مخلوق کو مطلع نہیں کیا گیا ہے۔ سابقہ مباحث میں یہ مذکور ہو چکا ہے کہ مفاتح الغیب یعنی علوم خمسہ میں قیامت کا علم بھی شامل ہے جس کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے مگر ان پانچ باتوں کا علم مجھے نہیں دیا گیا۔ آپ نے حضرت جبرئیل کے سوال پر یوں نہیں فرمایا کہ میں نہیں جانتا یا ہم دونوں نہیں جانتے کیوں کہ اس صورت میں کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید کسی اور کو اس کا علم ہو۔ اس لئے آپ ﷺ نے یہ ظاہر فرمایا کہ جس سے بھی قیامت کے متعلق پوچھا جائے گا وہ اس کے متعلق لاعلمی میں پوچھنے والے کی طرح ہی ہوگا۔ چناں چہ دیگر معتبر شارحین حدیث کی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی یہی مفہوم مراد لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''یعنی نیستم من دانا تر از تو بداں یعنی من وتو ہر دو برابریم در نادانستن آں بل کہ ہر سائل و مسئول ہمیں حال دارد کہ آنرا جز خداوند تعالیٰ کسے نداند و وے تعالیٰ ہیچ کس را از ملائکہ و رسول برآں اطلاع ندادہ۔'' (۴۵/ ب) ''میں قیامت کے وقت کو تم سے زیادہ نہیں جانتا یعنی میں اور تم اس کے نہ جاننے میں برابر ہیں بل کہ ہر سائل اور مسئول کا اس بارے میں یہی حال ہے کہ اس کو خداوند تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور خداوند تعالیٰ نے اپنے فرشتوں اور پیغمبروں میں سے اس کی اطلاع کسی کو نہیں دی ہے۔'' ملا علی قاری فرماتے ہیں۔ **ان علم الساعة لما استاثر الله تعالیٰ به** (۴۵/ ج) ''بے شک قیامت کا علم ان چیزوں میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خاص کرلیا ہے۔'' ہم نے یہ اقتباسات اس لئے پیش کئے ہیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ملا علی قاریؒ وغیرہ اہل علم نے اگر کسی مقام پر یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کل علوم یا علوم اوّلین و آخرین دیئے گئے تھے تو کل سے استغراق حقیقی مراد نہیں بل کہ وہ تمام علوم مراد ہیں جن کا آپ کے منصب جلیل سے تعلق ہے۔ یہ حضرات آپ کو عالم جمیع ما کان و ما یکون ہرگز نہیں سمجھتے تھے۔

حدیث جبرئیل کے متعلقہ حصے کی ان سے منقول شرح سے بھی یہی ثابت ہورہا ہے۔ حدیث جبرئیل حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے جس کے آخر میں یہ بھی ہے **فی خمس لا یعلمهن الا الله**

ثم تلا النبی ﷺ ان اللہ عندہ علم الساعۃ الایۃ (۴۶/الف) ''قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں شامل ہے جنہیں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃَ تا آخر آیت۔ اس سے اس (فاسد) تاویل کی مکمل بیخ کنی ہوجاتی ہے کہ حدیث جبرئیل میں ما المسئول عنہ باعلم من السائل کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کو قیامت کے وقت کا علم ہے مگر اسے صیغہ راز میں رکھا جائے۔ یہ تاویل اس لئے بھی باطل ہے کہ صحیح بخاری کی مشہور شروح فتح الباری اور عمدۃ القاری میں وہ متعدد روایات بھی پیش کی گئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی صورت میں آنے والے حضرت جبرئیل کو پہلے خود رسول اللہ ﷺ بھی پہچان نہیں پائے تھے۔ آپ نے اُنہیں نووارد اعرابی سمجھا، بعد میں آپ کو بہ ذریعہ وحی خفی علم ہوا کہ یہ تو حضرت جبرئیل تھے۔ (۴۶/ب) جب آپ نے پہلے اُنہیں پہچانا ہی نہیں تھا تو آپ ﷺ کو کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ اس نووارد گنوار (اعرابی) کو قیامت کے وقت کا علم ہے؟ اگر آپ ﷺ اپنی عمر مبارک کے آخری حصے میں بھی عالم الغیب اور حاضر وناظر ہوتے تو ضرور بالضرور حضرت جبرئیل کی آمد کا منظر ابتدا ہی سے آپ ﷺ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا اور ضرور بالضرور پہلی مرتبہ ہی آپ ﷺ اُنہیں پہچان لیتے۔ آپ اپنی عمر مبارک کے آخری دور میں بھی اپنے سے قیامت کے علم کی نفی فرماتے تھے۔ البتہ آپ ﷺ نے قیامت کی نشانیاں ضرور بیان فرمائیں کیوں کہ بہت سی غیبی جزئیات پر نہ کہ کل غیب پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مطلع فرمایا ہے۔ حدیث جبرئیل، حضرت امام ابوحنیفہؒ سے بھی متعدد اسناد سے منقول ہے۔ اس میں بھی بہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ مضمون ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل کو مکالمے کے دوران نہیں بل کہ بعد میں پہچانا تھا۔ (۴۶/ج) یہ واقعہ آپ ﷺ کی دنیوی حیات طیبہ کے آخری ایام کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حدیث جبرئیل کے ضمن میں فرماتے ہیں۔ ان رجلا فی آخر عمر النبی ﷺ جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ ومسلم (۴۷/الف) ''بے شک ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی عمر کے آخر میں آپ کے پاس آیا''۔ چناں چہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں انما جاء بعد انزال جمیع الاحکام لتقریر امور الدین (۴۷/ب) یعنی حضرت جبرئیل کی یہ آمد تمام احکام کے نزول کے بعد ہوئی تھی تاکہ اہم دینی امور کی (بر سر عام) توثیق وتاکید ہوجائے۔ پس روز روشن کی طرح واضح ہے کہ مکمل نزول قرآن کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ عالم جمیع ماکان وما یکون اور حاضر وناظر نہیں بنائے گئے تھے۔

ج:۱۔ سورۂ ابراہیم میں ہے کہ ''کیا تمہارے پاس تم سے پہلے کے لوگوں کی خبریں نہیں آئیں؟ قوم نوح، عاد اور ثمود کی، اور جو ان (قوموں) کے بعد آئے اُنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

(۴۷/ ج) اس آیت کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور عدنان کے درمیان تیس قرن ایسے ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور ان سے یوں بھی منقول ہے کہ عدنان اور حضرت اسماعیلؑ کے درمیان تیس آباؤ اجداد معلوم نہیں ہیں۔ (۴۸/ الف) حضرت عبداللہؓ بن مسعود اس آیت کی تلاوت کے وقت فرمایا کرتے تھے کذب النسابون کہ (حضرت آدمؑ تک پورا) نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔ (۴۸/ ب) یہی کلمات کذب النسابون ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے حضرت عمرؓ بن میمون سے بھی روایت کئے ہیں۔ علامہ نسفیؒ نے اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں یہی الفاظ خود رسول اللہ ﷺ سے روایت کئے ہیں۔ امام مالکؒ کے نزدیک یہ مکروہ ہے کہ کوئی شخص اپنا نسب حضرت آدمؑ تک مسلسل بیان کرے۔ خود رسول اللہ ﷺ کا نسب بھی ان کے نزدیک حضرت آدمؑ تک بیان کرنا مکروہ ہے۔ وہ آپ ﷺ کا نسب بیان کرتے ہوئے معد بن عدنان بن ادو سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ (۴۸/ ج) پس اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کا نسب حضرت آدمؑ تک بیان کرے تو اس کا فرض ہے کہ وہ یہ بھی واضح کردے کہ ادو سے آگے تک کا نسب یقینی نہیں بل کہ ظنی ہے ورنہ کذب النسابون کے کلمات کی زد میں وہ بھی یقیناً آئے گا۔

سورہ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہنم پر جو داروغہ فرشتے مقرر ہیں وہ انیس ہیں۔ اس پر قریش مکہ کو یہ تعداد کم معلوم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہنم پر مقرر داروغہ انسان نہیں بل کہ فرشتے ہیں اور یہ بھی فرمایا وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (۴۹/ الف) ''اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا'' یعنی جہنم کے داروغہ فرشتوں کے ماتحت یا مددگار فرشتوں کے جو لشکر ہیں اُن کی تعداد اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخلوق کو جمیع ما کان وما یکون کا علم نہیں دیا گیا ہے۔ یہ سمجھنا کہ ملائکہ کے یہ لشکر ابھی پیدا نہیں ہوئے محض کج بحثی اور فاسد تاویل ہے۔ یہاں لشکروں کی کثرت تعداد سے مخالفین کے استہزا کا جواب مقصود ہے اور صحیح معنوں میں یہ جواب تب ہی درست ہوسکتا ہے کہ یہ ملائکہ فی الحال موجود ہوں اور اتنی بڑی تعداد میں ہوں کہ لوگوں کے علم کی رسائی وہاں تک نہ ہوسکے۔

۲۔ سورہ سجدہ میں ہے کہ ان (اہل جنت) کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان مخفی رکھا گیا ہے، اسے کوئی شخص بھی نہیں جانتا، جو کچھ وہ کرتے ہیں یہ اس کا بدلہ ہے۔ (۴۹/ ب) اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **اعددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولااذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر ذخرامن بله ما اُطلعقم علیه ثم قرء فلاتعلم نفس مااخفی لهم الایة۔** (۴۹/ ج)۔ ''میں نے اپنے نیک

بندوں کے لئے ایسی چیزوں کو بہ طور ذخیرہ تیار کر رکھا ہے کہ کسی بھی آنکھ نے اُنہیں دیکھا نہیں اور کسی بھی کان نے اُن کا سنا نہیں اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں کبھی ان کا خیال گزرا ہے۔ اور یہ چیزیں جنت کی اُن نعمتوں کے علاوہ ہیں جن کی تم کو اطلاع ہے پھر آپ نے مذکورہ آیت تلاوت فرمائی۔'' یقیناً معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو ایسے مناظر اور ایسی اشیا دکھائی گئیں کہ کسی اور کے دل میں ان کا خیال بھی نہیں گزرا لیکن آیت میں زیر بحث جن نعمتوں کا ذکر ہے، ان کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا ہے کہ یہ اُن نعمتوں کے علاوہ ہیں جن پر کسی بھی مخلوق کو پہلے سے اطلاع ہے یعنی عالم غیب کی جو نعمتیں مخلوق کو بتائی گئی ہیں زیر بحث نعمتیں ان کے علاوہ ہیں۔ چناں چہ صحیح مسلم میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے سلسلۂ کلام میں یہ پوچھا کہ جنت میں اعلیٰ درجے والوں کو کیا کیا نعمتیں حاصل ہوں گی تو اللہ عزوجل نے فرمایا **غرست کرامتهم بیدی وختمت علیهما** کہ میں نے ان کے انعام واکرام کو اپنے ہاتھ سے محفوظ کیا ہے اور میں نے اس پر مہر لگادی ہے۔ آگے ارشاد ہے کہ کسی آنکھ نے ان نعمتوں کو نہیں دیکھا اور کسی کان نے اُنہیں نہیں سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں ان کا گزر ہوا۔ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد حضرت مغیرہؓ نے قرآن کریم کی مذکورہ آیت کا ذکر کیا۔ (۵۰/ الف) جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے سر بہ مہر کردیا ہو پھر بعد میں وہ کسی کو بھی یہ چیز وقت سے پہلے دکھادے تو اس کا سر بہ مہر کرنا (معاذ اللہ) عبث ہوگا اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نعمتیں تیار کی جا چکی ہیں، مستقبل کے کسی وقت پر معلق وموقوف نہیں ہیں۔ یہ بھی معلو[illegible] یہ حسی نعمتیں ہیں محض معنوی نہیں ورنہ ان کے سر بہ مہر ہونے کا کیا مطلب ہوا؟ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی مذکورہ روایات واقعہ معراج سے بہت بعد کی ہیں، کیوں کہ ان دونوں حضرات نے اسلام کوئی ۷ ہجری میں جا کر قبول کیا ہے اس لئے معراج کے موقع پر بھی یہ مخفی نعمتیں رسول اللہ ﷺ پر ظاہر نہیں کی گئیں۔

۳۔ احادیث کا بڑا ذخیرہ چند راویوں سے امت تک منتقل ہوا ہے اس لئے انہیں اخبار آحاد کہا جاتا ہے، جب کہ قرآن کریم امت تک تواتر سے منتقل ہوا ہے اس لئے یہ مسلمہ اصول ہے کہ احادیث کو کتاب اللہ کے تابع کیا جائے گا۔ اگر کبھی قرآن وحدیث میں تعارض نظر آئے تو معقول تطبیق نہ ہونے کی صورت میں کتاب اللہ کو لیا جائے گا اور حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا خواہ وہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو چہ جائے کہ ضعیف بل کہ بسا اوقات موضوع روایات سے عقائد تک ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ سورہ صٓ میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ (قیامت کی) یہ (خبر) بہت بڑی خبر ہے جس سے تم منہ پھیر رہے ہو۔ مجھے

ملا اعلیٰ (بلند قدر فرشتوں) کی بات چیت کا کچھ علم نہیں ہوتا جب وہ باہم تکرار کر رہے ہوتے ہیں۔ میری طرف تو یہی وحی کی جاتی ہے کہ میں تو (لوگوں کو) صاف آگاہ کرنے والا ہوں۔ (۵۰/ ب) اگر رسول اللہ ﷺ عالم الغیب اور حاضر و ناضر ہوتے تو ملاء اعلیٰ کی گفتگو کا منظر آپ سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی اس گفتگو کی تفصیلات سے آپ بے خبر ہو سکتے تھے۔ معاملہ عقائد کا ہے اگر ایسا عقیدہ درست ہوتا تو بار بار قرآن کریم میں یہ مذکور ہوتا کہ ہمارا رسول ملاء اعلیٰ کی باتوں سے ہر وقت اور ہر جگہ ہمیشہ پوری طرح باخبر ہوتا ہے اور آپ سے ہرگز یہ دوٹوک اعلان نہ کرایا جاتا کہ مجھے ملاء اعلیٰ کی باتوں کا کوئی علم نہیں ہوتا جب وہ آپس میں بحث و تمحیص کر رہے ہوتے ہیں۔ اب مثلاً جامع ترمذی وغیرہ کی یہ روایات لیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''پھر میں نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا۔ اس نے اپنا دستِ قدرت میری پشت پر رکھا فتجلیٰ لی کلّ شیئی فعلمت مافی السموت والارض۔ تو ہر چیز میرے لئے روشن ہوگئی تو میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔'' اس طرح کی روایات کی متنازعہ استنادی حیثیت کو سراسر نظر انداز کر کے انہیں درست بھی سمجھ لیا جائے تو چوں کہ یہ سورہ ص کے مذکورہ مضمون سے سراسر معارض و مخالف نظر آ رہی ہیں اس لئے تطبیق کی معقول صورت یہ ہے کہ یہ ایک خاص وقت کی کیفیت ہے، دائمی نہیں اور ''کل، جمیع'' جیسے کلمات سے ہر جگہ حقیقی استغراق مراد نہیں لیا جاتا یعنی اس خاص وقت میں جو باتیں بھی رسول اکرم ﷺ کو ان کے منصب نبوت کے مطابق بتانی، دکھانی اور سکھانی منظور تھیں، وہی اس سے مراد ہیں۔ اس سے آپ عالم جمیع ما کان و ما یکون اور حاضر و ناظر نہیں ہو گئے ورنہ قرآن کریم میں آپ سے ملاء اعلیٰ کی باتوں سے بے خبر ہونے کا اعلان کرانے کی بہ جائے نہایت شد و مد سے باخبر ہونے کا بار بار اعلان کرایا جاتا تاکہ عقائد کے بارے میں کوئی ابہام نہ رہے اور سب پر حجت پوری ہو جائے۔

۷ بہ حوالہ آیات معیت وغیرہ

الف: کیا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی اپنی شان اور حیثیت کے مطابق شہید و بصیر (حاضر و ناظر) ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو یہی حق ہے۔ اگر کہا جائے کہ نہیں ہے تو اس کی بھرپور تردید قرآن کریم سے ہو رہی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَالَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا (۵۰/ ج) ''وہ (منافقین) لوگوں سے چھپتے ہیں اور وہ اللہ سے نہیں چھپ سکتے اور وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو ناگفتنی باتوں کے مشورے کر رہے ہوتے ہیں اور اللہ ان کے اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔'' اگر حضرات انبیاء علیہم

السلام اور اولیائے کرام حاضر و ناظر ہوں اور کوئی منظر ان کے علم اور ان کی نظر سے مخفی نہ ہو تو مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا کہ میرے علاوہ میرے پیغمبر اور ولی بھی سب کے سب ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ''اور وہ منافقین نہ صرف اللہ سے بل کہ انبیاء اور اولیا سے بھی نہیں چھپ سکتے۔ سورۂ حدید میں ہے کہ ''تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو تو وہ (اللہ) تمہارے ساتھ ہوتا ہے''۔ (۵۱/ الف) اور سورۂ مجادلہ میں ہے کہ ''تین شخصوں کی کوئی ایسی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ (اللہ) ان میں چوتھا ہوتا ہے، اور نہ پانچ کی مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے، اور نہ اس سے کم اور زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ پھر اللہ ان کو قیامت کے دن ان کے اعمال بتائے گا، بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے''۔ (۵۱/ ب) اگر رسول اللہ ﷺ بھی حاضر و ناظر ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ جہاں تین شخص سرگوشی کر رہے ہوں تو وہ چوتھا ہوتا ہے، پانچ ہوں تو وہ چھٹا ہوتا ہے بل کہ یوں فرماتا کہ چوتھا میرا رسول اور پانچواں میں ہوتا ہوں، چھٹا میرا رسول اور ساتواں میں ہوتا ہوں، بل کہ اگر سب ہی انبیاء علیہم السلام اور لاکھوں اولیائے کرام بھی حاضر و ناظر ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنے علاوہ ان کی معیت (ساتھ ہونے) کا بھی ذکر ضرور فرماتا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ اس گنتی میں عمل لکھنے والے ملائکہ یعنی نوری مخلوق کو شمار نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی شیاطین (ناری مخلوق) کو شمار میں لایا گیا ہے بل کہ صرف انسانوں کو انسانوں کے ساتھ شمار کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا تعلق نوع انسانی سے ہے۔ آپ حاضر و ناظر ہوتے تو آپ کو بھی یقیناً شمار میں لایا جاتا چناں چہ غار ثور میں جب آپ ﷺ ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ تھے تو سورۂ توبہ کی متعلقہ آیت میں ''ثانی اثنین'' (دو میں دوسرا) کا کلمہ لایا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر حضرت ابو بکر صدیقؓ سے فرمایا تھا ان اللہ معنا کہ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (۵۱/ ج) آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ دیگر انبیاء علیہم السلام بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ اوپر سورۂ مجادلہ کے مضمون میں یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ لوگ تھوڑے ہوں یا زیادہ، اللہ تعالیٰ بہ ہر حال ان کے ساتھ ہوتا ہے اور بہ روز قیامت وہ لوگوں کو ان کے اعمال بتائے گا، وہ ہر چیز کو بہ خوبی جانتا ہے۔ اگر رسول اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام بھی حاضر و ناظر ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کا بھی ذکر کرتا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اگر حاضر و ناظر ہیں تو اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر قیامت کے دن لوگوں کا حساب کتاب ان کے ذمہ ہے تو اس شق کی نفی سورۂ مجادلہ کے مذکورہ مضمون سے ہی ہو رہی ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کے اعمال سے باخبر کرنا اللہ کا کام ہے، پیغمبروں کی یہ ذمے داری نہیں ہے۔ دیگر کئی مواقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''دین کو لوگوں تک پہنچا دینا آپ ﷺ کا کام ہے اور حساب لینا آپ کا

نہیں بل کہ ہمارا کام ہے۔'' (۵۲/ الف) اگر حضرات انبیاء علیہم السلام اس لئے حاضر و ناظر ہیں کہ لوگوں کو برے کام کرتے دیکھ کر اُنہیں ان برے کاموں سے روکیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں تو بلاشبہ وہ اپنی دنیوی زندگی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بہ طریق احسن پورا فرماتے رہے لیکن اس دارِ فانی سے عالم بقا کو رحلت فرما جانے کے بعد وہ بہ راست ایسی کوئی ذمے داری نہیں نبھاتے بل کہ یہ ذمے داری ان کے سچے ورثا علمائے دین کے کندھوں پر آپڑتی ہے۔ لہٰذا یہ دوسری شق بھی خارج از بحث ہوئی ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمے داری سے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) بالکل غافل ہیں۔ اگر حضرات انبیاء علیہم السلام اس لئے حاضر و ناظر ہیں کہ وہ قیامت کے دن لوگوں کے اعمال کی تفصیلی گواہی دیں گے تو لوگوں کی اکثریت تو برے اور ناپسندیدہ کاموں میں لگی رہتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ میرے بندوں میں سے شکرگزار بندے تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔ (۵۲/ ب) اس صورت میں یہ سب کے سب انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام ہر شخص کے برے کاموں پر چشم دید گواہ بن جائیں گے۔ مجرموں کے خلاف گواہی دینے والا ہرگز مجرموں کے حق میں سفارش نہیں کیا کرتا۔ اس مفروضے کی صورت میں تو کوئی بھی پیغمبر کسی کے حق میں سفارش نہیں کرے گا۔ کوئی بھی پیغمبر اس لئے بھی سفارش نہیں کرے گا کہ لوگوں کو ہر لمحے برے کاموں میں مبتلا دیکھ کر انبیاء علیہم السلام مستقل سخت رنجیدہ اور حالت غیظ و غضب میں رہنے پر مجبور ہوں گے۔ لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھ کر اگر اُنہیں خوشی بھی ہوتی ہوگی تو برے کام اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھ کر اُنہیں سخت تکلیف اور رنج بھی یقیناً ہوگا شیرینی میں تلخی ملانے سے غلبہ تلخی کو ہی ہوگا۔ برزخ کا جہان دنیا اور آخرت کے دونوں جہانوں کے درمیان ہے اس لئے دونوں کی بعض خصوصیات لئے ہوئے ہے۔ بے شک عالم آخرت میں نیک لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ رنجیدہ ہوں گے لیکن عالم برزخ میں دنیا والی رنجیدگی کے کچھ اثرات موجود ہو سکتے ہیں مثلاً رسول اللہ ﷺ نے معراج کی رات نوع انسانی کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا، ان کی دائیں جانب سعادت مندوں اور بائیں جانب بدبختوں کی ارواح تھیں۔ دائیں جانب دیکھنے پر حضرت آدمؑ خوش ہو کر ہنستے تھے اور بائیں جانب دیکھ کر وہ رنجیدہ ہو کر رونے لگتے۔ (۵۲/ ج) معراج کی رات چھٹے آسمان پر رسول اللہ ﷺ کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ آپ جب وہاں سے آگے بڑھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رو دیئے۔ ان سے رونے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمانے لگے کہ ایک نوجوان کو میرے بعد رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، میری امت کے لوگوں کی نسبت ان کی امت کے لوگ زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوں گے۔ (۵۳/ الف) ان روایات سے ثابت ہوا کہ عالم برزخ میں دنیوی زندگی کی

طرح رنج وغم کے واقعات کا ایک حد تک اثر ہوتا ہے۔ پس اگر حضرات انبیاء علیہم السلام حاضر وناظر ہونے کے (جھوٹے) مفروضہ عقیدے کے تحت ہمہ وقت براہِ راست برے لوگوں کے برے عمل دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے ہیں اور قیامت کے دن پر ہر بدعمل بدکار اور شخص کے ذرہ ذرہ عمل کی گواہی سخت غم وغصے کی حالت میں رب العالمین کی عدالت میں دیں گے تو وہ یکا یک شفیع کیسے بن جائیں گے؟ اس (جھوٹے) عقیدے کے تحت سفارش اس لئے بھی سخت مخدوش ہے کہ ایسا شخص جب بھی کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ صرف رب العالمین ہی نہیں بل کہ لاتعداد انبیاء اور اولیاء بھی اس پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یعنی نہ تو وہ اللہ سے شرماتا ہے اور نہ ہی کسی نبی اور ولی کو خاطر میں لاتا ہے۔ اس کے برعکس جس کا عقیدہ صحیح ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جب بھی میں کوئی اچھا یا برا کام خلوت میں کرتا ہوں تو صرف میرا رب مجھے دیکھتا ہے اور انسانوں میں سے مجھے کوئی بھی دیکھ نہیں رہا ہوتا اس لئے انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام اس پر گواہ نہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس کے خلاف گواہی نہیں دیں گے یعنی ان کی گواہی اجمالی ہوگی کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے پیغامات کو لوگوں تک پہنچا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حجت پوری کردی تھی۔ وہ لوگوں کے تفصیلی اعمال سے باخبر نہیں ہوں گے چناں چہ سورۂ مائدہ میں ہے کہ" جس دن (یعنی بہ روز قیامت) اللہ رسولوں کو جمع کرے تو ان سے کہے گا کہ تمہیں (تمہاری امتوں کی طرف سے) کیا جواب دیا گیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں بے شک غیبوں کا جاننے والا تو ہی ہے۔" (۵۳/ب) حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں **معناہ لا علم لنا کعلمك فیهم لانك تعلم مااضمروا وما اظهروا فعلمك فیهم انفذ من علمنا وابلغ** (۵۳/ج)۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں ان کا ایسا علم نہیں جیسے تیرا علم ان کے بارے میں ہے کیوں کہ تو جانتا ہے جو انہوں نے چھپایا اور جو انہوں نے ظاہر کیا (ہمیں تو صرف ان کے ظاہر کا علم ہے) ان کے بارے میں تیرا علم زیادہ گہرا اور کہیں زیادہ کامل ہے۔" عقل سلیم کی روشنی میں سورۂ مائدہ کی متعلقہ آیت کی یہی بہترین اور معقول تفسیر ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب ادب اور تواضع کے تقاضوں کے بھی عین مطابق ہے لیکن یہ کسی بھی معتبر مفسر کا قول نہیں اور نہ ہوسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تواضع اور انکسار کے پردے میں (معاذ اللہ) خلاف حقیقت کوئی بات کہیں گے۔ اس آیت کی یہ تفسیر مرجوح بل کہ نہایت ہی ضعیف بل کہ ناقابل قبول ہے کہ انبیاء علیہم السلام قیامت کے دن کسی گھبراہٹ، خوف اور دہشت کی وجہ سے ذہول ونسیان کا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) شکار ہوجائیں گے، خصوصاً سیّد المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ فداابی وامی کے متعلق ایسا گھناؤنا تصور ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کی شہادت تو یہ ہے کہ بہ

روز قیامت عام نیک لوگوں کو بھی کوئی بڑی گھبراہٹ لاحق نہیں ہوگی۔ سورۂ انبیاء میں ہے لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ط هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۵۴/الف) اُنہیں (بہ روز قیامت) بڑی گھبراہٹ (بھی) غم گین نہ کر سکے گی اور فرشتے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے، یہی تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا تھا۔'' سورۂ نمل میں ہے کہ جو شخص نیک عمل لائے گا اسے اس سے بہتر بدلہ ملے گا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ (۵۴/ب) ''اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے۔'' سورۂ انعام میں ہے فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۵۴/ج) ''تو جو شخص بھی ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کئے تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔'' اس طرح کا مضمون اور بھی کئی مقامات پر ہے۔ سورۂ عبس میں ہے وَجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ (۵۵/الف) ''کچھ چہرے اس دن روشن، ہنستے ہوئے اور ہشاش بشاش ہوں گے۔'' ان مضامین سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن نیک لوگوں کو ابتدائی مراحل میں کوئی وہمی خوف ہوا بھی تو وہ حقیقت میں تبدیل نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ ہوگا کہ یہ خوف حساب کتاب اور سوال و جواب کے مراحل تک بھی (معاذ اللہ) ساتھ چمٹا رہے۔ ایسا تو عام نیک لوگوں کے ساتھ بھی نہیں ہوگا چہ جائے کہ اپنے (جھوٹے) عقائد کے تحفظ میں ضعیف اور مرجوح اقوال کا سہارا لیتے ہوئے اس کی نسبت حضرات انبیاء علیہم السلام کی جانب اور خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی جانب کر دی جائے اور اسے بہ زعم خویش حب رسول قرار دیا جائے بل کہ کسی صحابی کے مختلف تفسیری اقوال میں سے اُنہیں اقوال کو قبول کرنا ہوگا جو ان کے شایان شان ہوں۔ سورۂ مائدہ کی زیر بحث آیت کی صحیح اور نہایت معقول تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف سے اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ قیامت کے دن کی پریشانی اور گھبراہٹ کی تفسیر ان سے منقول بھی ہو تو ظاہر ہے کہ یہ اخبار آحاد کا تعارض ہے اور اس میں پہلا قول یقیناً راجح بل کہ بہترین اور دوسرا قول مرجوح بل کہ متروک قرار پائے گا۔ الغرض عقل و نقل دونوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام حاضر و ناظر نہیں ہیں۔ جو شخص ایسا سمجھتا ہے وہ ان کی زندگی کو تلخ اور اپنے حق میں ان کی سفارش کو مخدوش ٹھہرانے پر تلا ہوا ہے۔ عالم برزخ میں حضرت آدمؑ کا اپنی دائیں جانب جنتیوں کی ارواح کو اور بائیں جانب جہنمیوں کی ارواح کو دیکھنا اختیاری عمل ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ بار بار بائیں جانب دیکھتے ہوں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسے حاضر و ناظر بنا دیا گیا ہو وہ تو لازماً ہر طرح کے خوش گوار و ناخوش گوار مناظر دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ اشکال پیدا نہیں ہوتا، وہ مخلوق اور اس کے عوارض سے بالاتر ہے۔ اس کی خوشی اور اس کا غصہ مخلوق جیسا نہیں ہے۔ اس کی تمام صفات حضوری ہیں، حصولی نہیں ہیں کہ

کسی نے اسے دی ہوں یا کسی بھی ذریعے اور سبب کا وہ (معاذ اللہ) محتاج ہو۔ بات اللہ تعالیٰ کی معیت کی ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو فرمایا۔ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی (۵۵/ب) ''بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں (اس لئے) تم ڈرو نہیں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔'' یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم دونوں کے ساتھ میرے انبیائے سابقین بھی ہیں۔ حضرت موسیٰ جب اپنی قوم کو لے کر مصر سے جا رہے تھے، آگے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر تھا، قوم کے لوگ کہنے لگے ہم تو پکڑے گئے تو حضرت موسیٰ نے فرمایا۔ کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ (۵۵/ب) ''خبردار! میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے (اس مصیبت سے بچ نکلنے کی) راہ دکھائے گا۔'' دیکھئے یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ میرے ساتھ انبیائے سابقین بھی ہیں۔ سورۂ نحل میں ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ (۵۵/ج) ''بے شک اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں کے ساتھ ہے جو نیکوکار ہیں۔'' دیکھئے یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کے ساتھ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام بھی موجود ہوا کرتے ہیں۔ بے شک کسی چیز کا کسی موقع پر مذکور نہ ہونا اس کی دلیل نہیں کہ وہ چیز موجود بھی نہ ہو یعنی عدم ذکر سے کسی چیز کا عدم وجود ثابت نہیں ہوتا لیکن معرض ذکر میں تو تذکرہ ضروری ہے۔ معاملہ عقائد کا ہو تو ضروری باتوں کا تذکرہ لازماً ہونا چاہئے۔ اگر حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام ہر وقت اور ہر جگہ خواہ اپنے اجساد و ارواح کے لحاظ سے یا اپنے علم کے لحاظ سے حاضر و ناظر ہوتے تو مذکورہ طرز کی تمام آیات معیت میں ان کی معیت کو (عقائد کے بارے میں اتمام حجت کے لئے) کو یقیناً اور لازماً بیان کیا جاتا۔ سورۂ یونس میں ہے اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْنَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ اللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَایَفْعَلُوْنَ (۵۶/الف) ''یا تو جس چیز کا ان سے ہم وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ ہم تجھے دکھا دیں گے یا ہم تجھے وفات دے دیں گے، تو ہماری طرف ہی ان کا لوٹ کر آنا ہے پھر اللہ ہی ان کاموں پر گواہ ہوگا جو وہ کرتے ہیں۔'' جو حاضر و ناظر ہو اسے کوئی بھی منظر جزوی یا کلی طور پر دکھانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوا کرتی، وہ تو پہلے ہی سے سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس سے قطعیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ رسول اکرم ﷺ اپنی دنیوی حیات طیبہ میں حاضر و ناظر نہیں تھے۔ اصلاح و تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے لئے آپ ماتحت الاسباب (اختیاری اسباب کے تحت) متعلقہ لوگوں کے اعمال پر نظر رکھتے تھے۔ اس دار فانی سے رحلت کے بعد آیت مذکورہ کے مطابق لوگوں کے اعمال پر آپ ﷺ گواہ نہیں بل کہ اللہ گواہ ہے یعنی آپ عالم برزخ میں بھی حاضر و ناظر نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا

کہ آپ ﷺ پر یا دیگر متعلقہ لوگوں پر دنیا کے لوگوں کے جو اعمال پیش کئے جاتے ہیں، یہ عرض اعمال اسی لئے تو ہے کہ آپ ﷺ حاضر و ناظر نہیں ہیں ورنہ جو عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہو وہ ماضی، حال اور مستقبل ہر زمانے کے ہر حال اور ہر عمل اور ہر منظر سے پہلے ہی باخبر ہوتا ہے اور یہ عرض اعمال بھی اجمالی ہے، تفصیلی ہو تو ایک مرتبہ کی عرض اعمال ہی کافی ہے بار بار اعادے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ لوگوں کے ایک ایک عمل پر خود گواہ ہوں تو گواہ کی حیثیت اور اس کا منصب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ملزم پر جرم ثابت کرنے یا اسے جرم سے بری قرار دینے کے لئے گواہی دے، وہ ہرگز مجرم کے حق میں شفیع نہیں ہوا کرتا۔ ہاں اگر آپ ﷺ پر ملائکہ کے ذریعے بہ حکم الٰہی امت کے اعمال اجمالاً نہ کہ تفصیلاً اس طرح پیش کئے جائیں جس سے آپ ﷺ کی طبیعت میں تکدر اور انقباض پیدا نہ ہو تو تیسرے فریق کی حیثیت سے آپ ﷺ ان شاء اللہ العزیز شفیع المذنبین ہوں گے۔ سورۂ ق میں ہے کہ بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم ان وسوسوں کو بھی جانتے ہیں جو اس کے دل میں آتے ہیں اور ہم اس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (۵۶/ب) دیکھئے اگر حضرات انبیاء علیہم السلام بھی عالم جمیع، کان و ما یکون اور حاضر و ناظر ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کا بھی ذکر فرماتا کہ وہ بھی ہر انسان کے وسوسوں سے باخبر اور ان سے قریب ہوتے ہیں کیوں کہ عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہر کسی کے ظاہر سے ہی نہیں بل کہ باطن سے بھی پوری طرح باخبر ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ میں جب تک (دنیا میں) اپنی قوم کے اندر رہا تو (عام اختیاری اسباب کے تحت) ان کے حال پر گواہ تھا پھر جب تو نے مجھے اُٹھالیا كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۵۷/الف) ''پھر (اے اللہ!) تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔'' الغرض کسی بھی پیغمبر نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں ہر چیز پر گواہ ہوں۔ اللہ ہی ہر چیز پر حاضر و ناظر بہ معنی شہید و بصیر ہے۔

اگر انبیاء علیہم السلام جسد مبارک کے ساتھ حاضر و ناظر ہیں تو اس (غلط) عقیدے کی رو سے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہجرت کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کرنا سب کا سب (معاذ اللہ) غلط ٹھہرتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کا معراج کے موقع پر مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک جانا، مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچنا، غزوات بدر، احد، فتح مکہ، حنین، تبوک وغیرہ کے لئے نکلنا، حج و عمرہ کے لئے سفر کرنا، نماز کے لئے گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر جانا، عیدین کی نماز کے لئے عیدگاہ تشریف لے جانا اور وہاں سے واپس لوٹنا وغیرہ وغیرہ سب (معاذ اللہ) خلاف عقل

اور غلط ٹھہرتا ہے۔ جب آپ ﷺ ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہیں تو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل وحرکت کا کیا معنی ہوا؟ سورۂ انعام میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کا مذاق اُڑاتے ہیں، تو ان سے کنارہ کرلیا کر یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہوجائیں اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔'' (۵۷/ب) یہاں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے اور امت مسلمہ کے اَفراد بالواسطہ مخاطب ہیں۔ اگر یہ تاویل کی جائے کہ خطاب رسول اللہ ﷺ سے نہیں بل کہ قرآن پڑھنے اور سننے والے کسی بھی شخص سے ہے تو اس کھینچا تانی سے بھی بات نہیں بنے گی کیوں کہ رسول اللہ ﷺ تو شریعت کے اوّلین پابند ہیں۔ کسی بھی غیر شرعی مجلس میں آپ ہرگز شامل نہیں ہوسکتے۔ یہ تاویل اس لئے بھی صحیح نہیں کہ ایسا ہی حکم عام مسلمانوں کے لئے الگ بھی دیا گیا ہے چناں چہ سورۂ نساء میں ہے کہ ''اللہ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اُتار چکا ہے کہ جب تم کسی مجلس میں (لوگوں کو) اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اُڑاتے سنو تو تم اس مجمع میں ان کے ساتھ مت بیٹھو جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں نہ لگ جائیں (ورنہ) تم بھی اُس وقت اُنہیں جیسے (ظالم) سمجھے جاؤ گے۔ بے شک اللہ تمام کافروں اور منافقوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔'' (۵۷/ج) اگر رسول اکرم ﷺ ہر وقت اور ہر جگہ حاضر وناظر ہیں تو مذکورہ قرآنی حکم پر عمل کرنا آپ ﷺ کے لئے کیسے ممکن تھا؟ آپ کے لئے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کافروں اور منافقوں جیسا ہونے سے بچنا کیسے ممکن تھا؟ کیا اس غلط عقیدے سے آپ ﷺ کی سخت توہین لازم نہیں آتی؟ سورۂ انفال میں ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (۵۸/الف) ''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تیرے ان کے اندر موجود ہوتے ہوئے اُنہیں عذاب دے۔'' یہ صحیح ہے کہ آپ ﷺ کی دعا اور آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی وجہ سے تمام امت پر بہ یک وقت عام عذاب نہیں آئے گا لیکن اگر آپ ﷺ حاضر وناظر ہیں تو کسی طرح کا بھی عذاب خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی بھی جہان میں کسی کو بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اِدھر رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے وعذابها فی الدنیا الفتن والزلازل والقتل (۵۸/ب) ''یعنی اس امت کا دنیا میں عذاب یہ ہے کہ فتنے برپا ہوں گے، زلزلے آئیں گے اور (لوگوں میں) خوں ریزی ہوگی۔'' پس قرآن کریم میں رسول اکرم ﷺ کے لئے شہید اور شاھد جیسے کلمات لانے سے آپ ﷺ کا عالم الغیب اور حاضر وناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا ورنہ ایسی آیات کے نزول کے ساتھ ہی آپ ﷺ ان اوصاف کے مالک ہوتے اور بعد کے ادوار میں کوئی چیز بھی آپ ﷺ سے مخفی نہ رہتی۔ ان کلمات اور دیگر متعلقہ امور کی وضاحت ہم نے مضمون ''ایجاز القرآن'' کے تحت سورۂ فاتحہ کے مباحث میں دوسرے شبہے کے جواب میں کردی ہے۔ (۵۸/ج)

ب:۱۔ سورۂ آل عمران میں ہے کہ تم، اللہ کے ساتھ کفر کیوں کر کرو گے حال آں کہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں۔ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ (۵۹/ الف) ''اور تمہارے اندر اس کا رسول موجود ہے۔'' سورۂ حجرات میں ہے کہ اِنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَہٗ بے شک تمہارے اندر اس کا رسول ہے اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔'' (۵۹/ ب) ان قرآنی مضامین میں کلمات فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ سے رسول اللہ ﷺ کو حاضر و ناظر ثابت کرنا عجیب کج فہمی اور بدذوقی ہے۔ یہاں خطاب صحاب کرامؓ سے ہے پوری امت سے نہیں۔

اگر استدلال کا یہی حال ہے تو آپ ﷺ کے مدنی دور کے ان تمام منافقین کو بھی حاضر و ناظر قرار دینا ہوگا جو مسلمانوں کی باتیں سن کر یہودیوں کو پہنچایا کرتے تھے۔ چناں چہ سورۂ توبہ میں ہے وَفِیْکُمْ سَمّٰعُوْنَ لَھُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ (۵۹/ ج) ''اور تمہارے اندر ان (یہودیوں) کے لئے (جاسوسی کی غرض سے) تمہاری باتوں کو خوب سننے والے (منافقین بھی) موجود ہیں۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔'' سورۂ توبہ لحاظ نزول آخری سورتوں میں سے ہے جو سورۂ آل عمران اور سورۂ حجرات کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اسی سورۂ توبہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ کو اس وقت تک بھی منافقین کا پورا علم نہ تھا اور مسجد ضرار بنانے والے منافقین کو بھی آپ ﷺ پہلے پہل پہچان نہیں پائے تھے۔ ان منافقین کا علم آپ ﷺ کو بہ ذریعہ وحی ہوا۔

۲۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ (۶۰/ الف) ''نبی مسلمانوں کو ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔'' یہاں اگر آیت میں ''اولیٰ'' کو بہ معنی ''اقرب'' (قریب ترین) لیا جائے اور اس کا یہ غلط مطلب بیان کیا جائے کہ نبی ﷺ مسلمانوں سے بہت قریب ہونے کی بنا پر ان کے ساتھ ہر وقت موجود رہتے ہیں تو بھی دعویٰ ثابت نہ ہوا۔ دعویٰ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ ہر جگہ موجود ہیں اور بہ زعم خویش ثابت یہ کیا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ صرف مسلمانوں کے قریب ہوتے ہیں۔ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ (۶۰/ ب) ''بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آ پہنچا ہے۔'' جیسی آیات سے بھی حاضر و ناظر کا مسئلہ کشید کرنا مضحکہ خیز ہے۔ قرآن کریم کے متعلق بھی اسی طرح کے کلمات ہیں قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (۶۰/ ج) ''بے شک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (ہدایت کی) روشنی اور کتاب مبین آ چکی۔'' قرآن کریم مندروں، جنگلوں، دریاؤں، سمندروں، ریگستانوں وغیرہ اور متعدد گھروں میں موجود نہیں ہوتا۔

۳۔ ابن ماجہ کی ایک روایت کے مطابق جب کسی شخص کی بیوی اپنے خاوند سے لڑتی ہے تو جنت

میں حور اس کی آواز کو سن لیتی ہے اور اس لڑاکا عورت سے کہتی ہے کہ تو اپنے خاوند کو تکلیف نہ دے وہ تیرا تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہے، اصل میں تو وہ میرا خاوند ہے۔ یہاں اس بات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے کہ یہ ضعیف حدیث ہے تو بھی ایسی روایات سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے کسی کو کسی کی خاص آواز سنا دے۔ اس سے اس کا عالم جمیع ما کان و ما یکون اور حاضر و ناظر ہونا کیسے ثابت ہو گیا؟ کچھ نہایت ضعیف روایات اس طرح کی ہیں کہ ایک فرشتہ قیامت تک رسول اللہ ﷺ کی قبر پر کھڑا رہے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے تمام کان دیئے ہیں جو آدمی بھی درود پڑھتا ہے اس فرشتے کے ذریعے آپ ﷺ کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ ایسی روایات دل چسپ تو ضرور ہیں لیکن ان سے عقائد ثابت نہیں ہوتے۔ اگر آپ ﷺ واقعی عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہیں تو بہ ذات خود دور و نزدیک سے سب کچھ سن سکتے ہیں۔ یہ فرشتہ بے چارہ ناحق کیوں اتنی تکلیف اُٹھاتا ہے؟ پھر ایسی روایات سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ فرشتہ صرف درود شریف ہی سن سکتا ہے یا مثلاً (معاذ اللہ) لوگوں کی مغلظ گالیاں وغیرہ بھی سن لیا کرتا ہے۔ دعویٰ تو فرشتے کے حاضر و ناظر ہونے کا ہے اور سنتا وہ صرف درود شریف ہے اور وہ بھی بے مقصد۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہیں تو آہستہ آواز سے پڑھا جانے والا درود شریف بھی سن لیتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو آپ ﷺ حاضر و ناظر نہ ہوئے۔ اگر سن لیتے ہیں تو آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) وغیرہ پر نہایت بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنی حد سماعت کے اندر ہمارا آہستہ آواز میں سلام سن لیتا ہو لیکن ہم ہر بار لاؤڈ اسپیکر پر اسے السلام علیکم کہا کریں تو کیا یہ اس شخص کو ایذا پہنچانے والا بھونڈا مذاق نہیں ہوگا۔ چہ جائے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا جائے؟ اذان کا معنی اعلان ہے، خطبہ بھی دوسروں کو سنانا مقصود ہوتا ہے لہٰذا اس میں شامل درود شریف بھی لوگوں کو سنانا مقصود ہوتا ہے۔ اس صورت کے علاوہ لوگوں کو انتہائی بلند آواز سے تسبیح و تحمید یا درود شریف وغیرہ کے کلمات سنانا اگر شعوری یا غیر شعوری طور پر دکھاوے کی نیت سے ہے تو اس کا مذموم ہونا واضح ہے۔ اگر لوگوں کی اس سے تعلیم مقصود ہے تو اس کی ضرورت سرے سے اس لئے نہیں کہ نماز میں یہ تمام اذکار شامل ہیں۔ کوئی بھی نمازی شخص ان سے محروم نہیں رہ سکتا۔ دیگر اذکار کی طرح درود شریف بھی آہستہ پڑھنا چاہئے۔ افضل ترین عبادت نماز میں بھی اسے آہستہ اور بہ حالت قیام نہیں بل کہ بہ حالت قعدہ پڑھا جاتا ہے۔ درود شریف دراصل اللہ تعالیٰ سے رسول اللہ ﷺ پر نزولِ رحمت کی دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ آہستہ آواز بل کہ دل کی بات کو بھی جانتا ہے۔ اسی لئے احناف نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد امین (اے اللہ، قبول کر) والی دعا آہستہ پڑھتے ہیں اور آمین بالجہر والی روایات کو تعلیم امت

پر محمول کرتے ہیں۔ احناف جو "آمین" تک آہستہ کہنے کے قائل ہیں، اُنہیں کسی کی نظر بد کا شکار نہیں ہونا چاہئے تھا کہ وہ درود شریف جیسے اذکارِ عالیہ کو آلہ مکبر الصوت پر پڑھنے کا التزام کریں۔

۴۔ سورۂ تکویر میں ہے وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۲۱/الف) اگر یہاں ضمیر "ھو" کا مرجع قرآن کریم کی بہ جائے رسول اللہ ﷺ کو ہی قرار دیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ پیغمبر غیب کی خبریں بتانے میں بخیل نہیں ہے۔ ساری شریعت غیب ہے جو امورِ شریعت پیغمبر ﷺ کو بہ ذریعہ وحی پہنچائے گئے ہیں، آپ ﷺ نے اُنہیں بلاکم وکاست امت تک پہنچایا ہے۔ اس سے غیب کلی کے علم کا کوئی تعلق نہیں کیوں کہ یہ آیت سورۂ تکویر کی ہے جو مکی سورت ہے۔ اگر اس آیت سے آپ ﷺ عالم الغیب ہو گئے تھے تو بعد میں نزولِ قرآن کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اگر آپ ﷺ کو علم غیب دیا گیا ہے اور آپ اس کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیتے تو پھر پوری امت محمد یہ ﷺ کو عالم الغیب کہنا چاہئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس میں استعداد ہو اسی کو رسول اللہ ﷺ عالم الغیب اور حاضر وناظر بناتے ہیں تو صحابہ کرامؓ خصوصاً عشرۂ مبشرہ اور خلفائے راشدینؓ سے بڑھ کر یہ (مفروضہ) استعداد اور کس میں ہوسکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرضِ وفات کے آخری ایام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نماز کی امامت کے لئے مقرر فرمایا۔ اتفاقاً وہ مسجد میں موجود نہیں تھے۔ کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ کو نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھا دیا۔ ان کی آواز اونچی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حجرۂ مبارک میں ان کی آواز پہچان لی تو آپ نے پیچھے ہٹنے کا حکم صادر فرمایا کہ مسلمانوں کو نماز صرف اور صرف حضرت ابوبکرؓ ہی پڑھائیں گے۔ اگر حضرت عمرؓ عالم الغیب اور حاضر وناظر ہوتے تو یقیناً اُنہیں علم ہوتا کہ میرا آگے بڑھنا رسول اللہ ﷺ کو سخت ناگوار گزرے گا۔ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے والے جلیل القدر مہاجرین وانصار جن میں عشرۂ مبشرہ میں شامل حضرات بھی تھے، اگر عالم الغیب ہوتے تو اُنہیں بھی یہ معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سوا کسی اور کی امامت نماز ہرگز پسند نہیں آئے گی۔ نہ حضرت عمرؓ آگے بڑھتے اور نہ ہی ان کے پیچھے نماز پڑھنے والے صحابہ کرامؓ اُنہیں امامت کے لئے آگے بڑھنے دیتے۔ کیا ان سب حضرات میں غیب کلی کا علم حاصل کرنے اور حاضر وناظر بنائے جانے کی (مفروضہ) استعداد تھی یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا اس سے ان کی توہین تو نہیں ہوتی؟ نیز اگر ان میں یہ استعداد نہیں تھی تو بعد کے لوگوں میں یہ استعداد کہاں سے آ ٹپکی؟ اگر ان میں (مفروضہ) استعداد موجود تھی تو کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان عزیز ترین اصحابؓ کو غیب کلی کا علم سکھانے میں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) بخل سے کام لیا تھا یا نہیں؟ اگر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) بخل سے کام لیا تھا تو قرآن کریم کا یہ مضمون کیسے درست ہوا کہ آپ ﷺ غیب کی خبریں

بتانے میں بخیل نہیں ہیں، اور کیا اس (خبیث) مفروضے سے آپ ﷺ کی سخت توہین لازم نہیں آتی؟ اگر آپ بخیل نہیں تھے تو کم از کم عشرۂ مبشرہ میں شامل حضرات یا ان میں سے کم از کم خلفائے راشدین تو ضرور بالضرور عالم الغیب اور حاضر وناظر ہو جاتے لیکن یہ اوصاف اُنہیں رسول اللہ ﷺ کی دنیوی حیات طیبہ کے آخری ایام تک بھی حاصل نہ ہوئے گویا آپ ﷺ نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اپنی دنیوی زندگی کے آخری ایام تک بھی بخل نہیں چھوڑا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ زیر بحث قرآنی آیت کا یہ مفہوم ہرگز ہرگز صحیح نہیں کہ آپ ﷺ (مفروضہ) صاحب استعداد لوگوں کو غیب کلی کا علم سکھاتے اور اُنہیں حاضر وناظر بناتے ہیں۔ یہ معنی لینے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی سخت توہین لازم آتی ہے جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ عالم الغیب اور حاضر وناظر ہوتے تو ان کے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ ہرگز اُنہیں جمع وتدوین قرآن کا از خود مشورہ دینے کی جسارت نہ کرتے۔ غیب دان کسی کے مشورے کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ جمع وتدوین قرآن کے حضرت عمرؓ کے مشورے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے پہل ردوقدح نہ کرتے، اُنہیں تو شرح صدر بعد میں جا کر حاصل ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں حضرت حذیفہؓ بن الیمان آرمینیا کے محاذ پر تھے۔ اُنہوں نے لوگوں کو قرأت قرآن پر باہم اختلاف کرتے دیکھا تو وہاں سے واپسی پر حضرت عثمانؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن کریم کی کتابت لغت قریش پر کروا کر اسے عام کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ عالم الغیب ہوتے تو فوراً کہہ دیتے ''بھیا! اپنی راہ لو، میں غیب دان اور حاضر وناظر ہوں، سب کچھ جانتا اور سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہوں۔ میں کسی کے مشورے کا محتاج نہیں ہوں۔'' الغرض جب صحابہ کرام اور خلفائے راشدین تک کو غیب کلی کا علم نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی وہ حاضر وناظر بنائے گئے تھے تو بعد کے زمانے کے لوگوں میں یہ استعداد کہاں سے اور کب آ گئی؟

۵۔ سورۂ نساء میں ہے وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۶۱/ب) ''اور اللہ نے تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو جانتا نہیں تھا اور اللہ کا تجھ پر بڑا فضل ہے۔'' اس طرح کی آیات سے بھی رسول اللہ ﷺ کا عالم الغیب ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ آیت کا مطلب واضح ہے کہ دین وشریعت کی جو باتیں پہلے آپ ﷺ کو معلوم نہیں تھیں وہ بہ ذریعہ وحی آپ کو اور پھر آپ کے ذریعہ صحابہ کرامؓ اور ان کے توسط سے پوری اُمت کو بتا دی گئیں۔ چناں چہ سورۂ بقرہ میں ہے وَيُعَلِّمُكُمْ مَالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۶۱/ج) ''اور وہ (نبی) تمہیں ایسی چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جنہیں تم (پہلے) نہیں جانتے تھے۔'' یہودیوں کے متعلق سورۂ انعام میں ہے۔ وَعُلِّمْتُمْ مَالَمْ تَعْلَمُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَآؤُكُمْ (۶۲/الف) ''اور تمہیں وہ کچھ سکھایا گیا جو تم اور تمہارے باپ دادا نہیں جانتے تھے۔'' علم کا ذریعہ جو بھی

ہو، تمام اسباب علم اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں چناں چہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات جو رسول اللہ ﷺ پر غارِ حرا میں سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں، ان میں یہ آیت بھی ہے وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (۶۲/ب) ''اور اس (اللہ) نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔'' اگر ان آیات میں لفظ ''ما'' سے غیب کلی کا سکھایا جانا مراد ہو تو بہ شمول صحابہ کرامؓ سارے مسلمان، سارے یہودی بل کہ سارے انسان عالم الغیب ہونے چاہئیں۔ یہاں یہ تاویل غلط ہے کہ جب عام لفظ مطلق بولا جائے تو اس سے اس کا ہمیشہ فرد کامل ہی مراد ہوا کرتا ہے لہٰذا سورۂ علق کی مذکورہ آیت میں لفظ ''الانسان'' سے رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ اس طرح کے مہمل دعوے سے تو آپ ﷺ کی سخت توہین لازم آتی ہے کیوں کہ سورۂ علق کی مذکورہ آیت کے متصلاً بعد اگلی آیت یہ ہے کَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ''خبردار! بے شک انسان سرکشی کرتا ہے۔'' اور مثلاً سورۂ عادیات میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ (۶۲/ج) ''بے شک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔'' سورۂ علق کی ابتدائی آیات سب سے پہلی وحی کی آیات ہیں۔ اگر یہاں کلمہ ''ما'' سے حقیقی استغراق مراد ہو تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ظہور رسالت کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ عالم جمیع ماکان و مایکون ہو گئے تھے۔ پھر باقی ماندہ قرآن آپ ﷺ پر کوئی ۲۳ برس تک کیوں نازل ہوتا رہا؟ صحابہ کرامؓ بھی عالم الغیب اور حاضر و ناظر نہیں تھے جیسا کہ ابھی اوپر نکتہ نمبر ۴ میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

۶۔ قرآن کریم میں جا بہ جا رسول اللہ ﷺ کا یہ منصبی فریضہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان (کے اخلاق) کا تزکیہ فرماتے ہیں وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ عربی زبان میں فعل مضارع حال کے علاوہ مستقبل کا معنی بھی دیتا ہے لیکن سیاق کلام سے معنی متعین کرنے میں دُشواری نہیں ہوا کرتی۔ رسول اللہ ﷺ بلاشبہ اپنی دنیوی حیات طیبہ میں اپنے سامنے موجود اپنے اصحاب کو عام اختیاری اسباب کے تحت کتاب و سنت کی تعلیم دیتے تھے اور ان کے اخلاق کو سنوارتے تھے۔ دور دراز کے علاقوں میں دینی تعلیم کے لئے آپ ﷺ نے اپنے جلیل القدر اصحاب کو متعین فرمایا۔ مثلاً اس مقصد کے لئے آپ ﷺ نے یمن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مبلغ و معلم بنا کر بھیجا۔ ہجرت مدینہ سے پہلے آپ ﷺ نے مدینے کے لوگوں کو دعوت اسلام دینے اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو روانہ فرمایا۔ ظاہر ہے کہ مدینے اور یمن کے لوگوں کو دین کی تعلیم آپ ﷺ کی طرف سے بہ راست نہیں بل کہ بالواسطہ تھی۔ اس دارِ فانی سے آپ کی رحلت کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ اہل حق علمائے دین کی وساطت سے برابر جاری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت تا قیامت نافذ ہے۔ ''پس محمد رسول اللہ'' کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کسی زمانے میں رسول تھے اور اب

(معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) رسول نہیں۔ بل کہ انبیائے سابقین کی نبوت بھی قائم و دائم ہے۔ چوں کہ سابقہ شرائع منسوخ ہو چکی ہیں اس لئے منصب نبوت پر قائم رہنے کے باوجود دنیا میں ان کے منصبی فرائض معطل وموقوف ہیں جب کہ رسول اکرم ﷺ کے منصبی فرائض اہل علم کے توسط سے جاری وہ ساری ہیں اور اسی طرح انشاء العزیز جاری رہیں گے۔ اس وضاحت کے بعد بھی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِم جیسے کلمات سے آپ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے پر استدلال عجیب کج فہمی بل کہ بدفہمی ہے جو قرآن کریم کے مضامین سے (معاذ اللہ) لہو ولعب کے مترادف ہے۔ دنیوی حیات میں جب آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور یثرب (مدینہ منورہ) کے لوگ یہ کہتے تھے کہ مُحمد اللہ کے رسول ہیں، آپ ﷺ معلم کتاب وحکمت ہیں، تو اس طرح کے کلمات کا یہ مطلب وہ ہرگز نہیں لیتے تھے کہ آپ حاضر و ناظر ہیں۔ آپ کی اس دارِفانی سے رحلت ہوئی تو اس طرح کے کلمات سے آپ ﷺ عالم الغیب اور حاضر و ناظر کیسے ہو گئے؟

۷۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ کو حاضر و ناظر ثابت کرنے کیلئے ایک حدیث قدسی پیش کی جاتی ہے کہ "جب انسان نوافل کے ذریعہ میرا (اللہ تعالیٰ کا) قرب حاصل کرتا ہے تو ایسا وقت بھی آتا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔" اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کے جوارح اور اعضا کو معصیت اور گناہ کے کاموں سے محفوظ فرما دیتا ہے تو بالکل درست ہے اور صحیح مطلب بھی یہی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ (معاذ اللہ) خدائی صفات کا مالک اور خدا ہو جاتا ہے یا وہ عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر و ناظر ہو جاتا ہے تو یہ وہی شرک ہے جس میں نصاریٰ مبتلا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مخلوق پر اثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ یا اس کی صفات مخلوق کے اندر حلول نہیں کرتیں اور مخلوق کو خدا نہیں بناتیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہے۔" (۶۳/الف) بہ قول نصاریٰ اللہ کی صفت کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گئی تھی اور وہ بہ قول ان کے خدا ہو گئے تھے۔

۸۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث ہے **ان اللہ طویٰ لی الارض حتیٰ رأیت مشارقھا ومغاربھا** (۶۳/ب) "بے شک اللہ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا یہاں تک کہ میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا۔" غیب دان اور حاضر و ناظر کو اس کی ضرورت نہیں ہوا کرتی کہ اس کے لئے زمین کو سکیڑا اور سمیٹا جائے۔ پھر زمین تو ہمارے نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے۔ اس طرح کے لاتعداد نظام ہائے شمسی اور

مخلوق کے علم کے اعتبار سے بے حد وحساب سیارے اور ستارے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء علیہم السلام کو کسی وقت حیرت انگیز غیبی مناظر دکھا دیں تو یہ دائمی نہیں ہوتے اور مخلوق پر کسی چیز کا انکشاف یہ ظاہر نہیں کرتا کہ اسے اشیا کا ہر طرح کا تفصیلی علم بھی حاصل ہوگیا۔ انسان پر سب سے زیادہ اس کا اپنا وجود منکشف ہے وہ اپنے وجود اور اس کی کیفیات سے جس قدر باخبر ہوتا ہے، دوسرے لوگ ہرگز نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود وہ اپنے ہی وجود کا تفصیلی علم نہیں رکھتا کہ مثلاً دن بھر میں اس کا دل کتنی مرتبہ دھڑکتا ہے اور مثلاً اس کے سر اور جسم کے دوسرے اعضا پر بالوں کی صحیح تعداد کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بعض روایات میں یوں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم (صحابہ کرامؓ) کو اس حال میں چھوڑ گئے کہ اگر کوئی پرندہ اپنے پروں کو حرکت دیتا ہے تو آپ ﷺ نے اس کا بھی ذکر فرمایا اور قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے، آپ ﷺ نے سب کچھ بیان فرمایا تو جس نے یاد رکھا سو یاد رکھا اور جس نے بھلا دیا تو بھلا دیا۔ ایسی روایات کا واضح مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بہت سے آئندہ ضروری واقعات کی خبر دی۔ جو فتنے قیامت سے پہلے اُٹھنے والے ہیں ان کا نہایت تفصیل سے ذکر فرمایا۔ جانوروں اور پرندوں وغیرہ کے متعلق حلال وحرام کی تفصیلات بتائیں۔ قیامت کی نشانیوں کی پوری وضاحت فرمائی کہ ان تمام امور کا تعلق دین سے ہے۔ ایسی روایات کا یہ مطلب لینا مضحکہ خیز کج فہمی ہے کہ آپ ﷺ نے مثلاً تمام حیوانات، جنگلی جانوروں، پرندوں، ان کی غذاؤں، ان کی حرکات وسکنات کا تفصیل سے ذکر فرمایا تھا کہ وہ مثلاً کتنی مرتبہ روزانہ بول وبراز وغیرہ کرتے ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام سے تا قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانی افراد کے نسب نامے بھی فرداً فرداً بیان فرمائے تھے وغیرہ وغیرہ۔ الغرض ایسی روایات سے آپ ﷺ کا عالم جمیع ما کان وما یکون ہونا اور حاضر وناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر لفظ ''جمیع'' نکال دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ آپ ﷺ کو آپ کے منصب نبوت کے شایان شان اور خاتم الانبیاء کی حیثیت سے تمام متعلقہ مسائل اور باتوں کی تعلیم دی گئی تو بالکل درست ہے۔ ورنہ مذکورہ حدیث کی رو سے اور نہیں تو کم از کم خلفائے راشدینؓ تو ضرور عالم الغیب ہو گئے ہوتے۔

زرقانیؒ کی شرح مواہب لدنیہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے لئے ساری دنیا کو پیش فرما دیا تو میں نے تا قیامت اس دنیا میں جو کچھ ہونے والا ہے، اسے اس طرح دیکھ لیا جیسے گویا میں اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں۔ ایسی انتہائی ضعیف روایات سے عقائد ثابت نہیں ہوتے بل کہ صحیح السند اخبار آحاد سے بھی عقائد ثابت نہیں ہوتے۔ اگر انہیں درست بھی سمجھ لیا جائے تو ایک خاص وقت کے انکشاف سے دائمی انکشاف ثابت نہیں ہوتا۔ نیز مخلوق پر کسی چیز کے

انکشاف سے اس کے متعلق تفصیلی علم کا حاصل ہو جانا بھی ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ انسان تو اپنے جسم کے متعلق بھی پوری طرح باخبر نہیں ہوتا حال آں کہ اس کا جسم اس پر اور سب چیزوں سے زیادہ منکشف ہوتا ہے۔ جب کسی کو اپنا تفصیلی علم بھی نہیں تو دوسروں کا کیسے ہوگا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ عالم جمیع ما کان وما یکون کیسے بن جائے گا؟

ترمذی کی ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ اس حال میں تشریف لائے کہ آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ دائیں ہاتھ والی کتاب میں جنتیوں کے اور بائیں ہاتھ والی کتاب میں جہنمیوں کے نام درج تھے اور ان کے آخر میں میزان تھی کہ ان ناموں میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ (۶۳/ ج) یہ کتابیں حسی تھیں یا مثالی، اس بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کو فرداً فرداً ہر جنتی اور جہنمی کا علم ہو گیا تھا تو آپ ﷺ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ ہرگز نہ پڑھاتے۔ عالم برزخ میں آپ ﷺ پر امت کے اعمال پیش کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہتی۔ عالم آخرت میں حوض کوثر پر آنے والے لوگوں کو بھی آپ ﷺ بہ خوبی پہچان لیتے اور ملائکہ کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ آپ کو علم نہیں کہ اُنہوں نے آپ ﷺ کے بعد کون کون سے کام کئے۔ کسی کتاب میں لوگوں کے نام درج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہر کسی کی تصویر بھی ساتھ ہی چسپاں ہو۔ الغرض ایسی روایات سے آپ ﷺ کا یا کسی بھی پیغمبر کا عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا کہ کتاب اللہ کی محکمات کو جھٹلایا جائے یا ان میں تاویلات فاسدہ کا دروازہ کھولا جائے۔

۹۔ ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے الگ الگ خصوصیات عطا فرمائی ہیں مثلاً جنات کی رسائی آسمان دنیا تک ہے۔ پرندے حتیٰ کہ مکھی اور مچھر تک فضا میں اُڑتے ہیں لیکن انسان میں یہ خصوصیات اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھیں۔ شیطان اعظم ابلیس اور اس کے ساتھی شیاطین کو اللہ تعالیٰ نے یہ قوت وصلاحیت دی ہے کہ وہ انسانی قلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آناً فاناً دور دراز کے فاصلے طے کرتے ہیں۔ انسان کو یوں دھوکہ دیتے ہیں کہ بسا اوقات اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ برے عقائد اور برے اعمال کو وہ مزین اور عمدہ کر کے دکھاتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ بے شک وہ (ابلیس) اور اس کے لشکر تمہیں ایسے طور سے دیکھتے ہیں کہ تم اُنہیں نہیں دیکھ پاتے۔'' (۶۴/ الف) ملائکہ آسمان سے زمین پر اُترتے اور زمین سے آسمان پر جاتے ہیں مگر انسانوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ اس کے باوجود ملائکہ عالم الغیب اور حاضر وناظر نہیں ہیں۔ مثلاً ملائکہ کو وہ نام معلوم نہیں تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے تھے اور اُنہوں نے اپنی بے خبری کا برملا اعتراف کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ میں آسمانوں اور

زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہوا سے بھی جانتا ہوں۔ (۶۴/ب) جنات بھی غیب نہیں جانتے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سرکش جنات کو سخت مشقت کے کاموں میں مشغول کر رکھا تھا۔ اسی حالت میں ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہوگئی لیکن جنات کو ایک مدت تک ان کے انتقال کا علم نہ ہوسکا۔ ان کو جب علم ہوا تو بڑی حسرت سے کہنے لگے کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس رسوا کن عذاب (محنت ومشقت) میں نہ پڑے رہتے۔ (۶۴/ج) ملائکہ اور جنات کو جو صلاحیتیں دی گئی ہیں ان میں کتنی ہی وسعت کیوں نہ ہو، اس کی حضرات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے اعلیٰ اور پاکیزہ علوم سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ شیاطین کو دی گئی بہ ظاہر عجیب وغریب صلاحیتیں ہرگز ان کی ایک عام نیک انسان پر بھی کسی فضیلت کو ظاہر نہیں کرتیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص ناحق یہ سمجھ لے کہ ابلیس کو بھی (معاذ اللہ) علم جمیع ما کان وما یکون حاصل ہے اور وہ حاضر وناظر ہے لہٰذا تمام انبیاء اور اولیاء بھی عالم الغیب اور حاضر وناظر ہیں تو ایسے کند ذہن شخص کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ خود بھی تو ابلیس سے کہیں بہتر ہے تو وہ خود کیوں عالم الغیب اور حاضر وناظر نہیں؟ انبیاء علیہم السلام کی بات تو وہ بعد میں کرے، پہلے اپنا حال بتائے۔ نیز اگر عالم الغیب اور حاضر وناظر ہونا مخلوق کے لئے واقعی کوئی کمال ہے اور یہ کمال اس شخص کے خیال میں شیطان اعظم ابلیس کو بھی حاصل ہے تو اس بے ہودہ مفروضے کو صحیح سمجھ لینے سے تو ابلیس کا علم (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) انبیاء کے علم کے بالکل برابر ہوجائے گا، کیا اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی سخت توہین نہیں ہوتی؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ اسی طرح سورج اور چاند کی روشنی کی وسعت کی مثالیں دے کر انبیاء اور اولیاء کو حاضر وناظر سمجھ لینا بھی مضحکہ خیز مغالطہ ہے۔ اس کائنات میں لاتعداد سورج اور چاند ہیں اور ہر مخلوق کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔

۱۰۔ حضرت یزیدؓ بن ثابت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے چند اصحاب کے ساتھ باہر نکلے۔ آپ ﷺ نے ایک تازہ قبر دیکھی تو دریافت فرمایا کہ یہ کس کی قبر ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یہ فلاں خاندان کی لونڈی کی قبر ہے۔ **فعرفها رسول الله صلى الله عليه وسلم** تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو پہچان لیا۔ اور اس کی قبر پر کھڑے ہوکر دعائے جنازہ پڑھی۔ حضرات صحابہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کا روزہ تھا اور آپ ﷺ آرام فرمارہے تھے لہٰذا ہم نے اس کے جنازے پر آپ کو مطلع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ **لايموت فيكم ميت وانا بين اظهركم الا اذنتمونى به فان صلوتى لهم رحمة** (۶۵/الف) ''میرے تمہارے اندر موجود ہوتے ہوئے تم میں سے کوئی مرجائے تو مجھے اس کی اطلاع کیا کرو کیوں کہ ان کے لئے میری دعا رحمت ہے۔'' اگر آپ ﷺ عالم

الغیب اور حاضر و ناظر ہوتے تو اس لونڈی کی بیماری، موت اور تدفین کے پورے مناظر آپ ﷺ کے سامنے ہوتے۔ صحابہ کرامؓ سے پوچھنے کی آپ کو ضرورت نہ ہوتی۔ صحابہ کرامؓ کے بتانے پر آپ ﷺ نے اس لونڈی کو پہچانا حال آں کہ حاضر و ناظر اور عالم الغیب سے کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''جب تک میں تمہارے اندر موجود ہوں'' یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی دنیوی حیات طیبہ میں ماتحت الاسباب یعنی عام اختیاری اسباب کے تحت مسلمانوں کے حالات پر نظر رکھتے تھے۔ آپ ﷺ ہر وقت اور ہمیشہ ہر چیز کو دیکھتے ہوں یعنی حاضر و ناظر ہوں تو آپ ﷺ کے کلام سے اس کی بھرپور نفی ہو رہی ہے۔ صحابہ کرامؓ کا اس سلسلے میں آپ ﷺ سے مکالمہ واضح کر رہا ہے کہ وہ بھی آپ کو حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ دورِ نبوی میں ایک مرد (یا عورت) مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتا تھا اور اسے صاف ستھرا رکھتا تھا۔ وہ رات کے وقت فوت ہو گیا تو حضرات صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کو مطلع کئے بغیر خود ہی اسے دفن کر دیا کیوں کہ انہوں نے اس جھاڑو دینے والے کے معاملے کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے اس خادم کو مسجد میں نہ پایا تو صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کو بتایا کہ وہ تو فوت ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ **افلا کنتم اذنتمونی دلونی علی قبرہ** کہ ''تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ مجھے اس کی قبر دکھاؤ۔ صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کو اس کی قبر کا بتلایا اور آپ نے اس پر دعائے جنازہ پڑھی۔'' (۶۵/ب) اس سے بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ حاضر و ناظر نہیں تھے اور نہ ہی صحابہ کرامؓ آپ کو ایسا سمجھتے تھے ورنہ مذکورہ سوال و جواب کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کسی سے کچھ پوچھے تو یہ پوچھنا ہرگز اس لئے نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی لئے احادیث میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے کسی سے سوال کے موقع پر ''**وھو اعلم**'' (حال آں کہ وہ بہ خوبی جانتا ہے) کے کلمات لائے جاتے ہیں۔ مثلاً فرشتے انسانوں کی مجالس ذکر سے فارغ ہو کر جب اللہ تعالیٰ کے پاس جاتے ہیں **فیسئل اللہ عنھم وھو اعلم**'' تو اللہ ان سے ان (اہل ذکر) کے متعلق پوچھتا ہے حال آں کہ وہ خوب جانتا ہے۔ (۶۵/ج) کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کسی سے کسی کے متعلق کچھ پوچھے تو جواب ملنے پر اس طرح کے کلمات لائے جائیں ''**فعرف**'' کہ اس نے جان لیا، پہچان لیا۔ لونڈی والی مذکورہ بالا روایت میں ہے کہ صحابہ کرامؓ کے بتانے پر رسول اللہ ﷺ نے اس متوفیہ لونڈی کو پہچان لیا۔ مخلوق حتیٰ کہ رسول اللہ کا کسی سے پوچھنا اکثر و بیشتر بہ غرض استفہام ہوتا ہے کہ جو بات پہلے معلوم نہیں وہ

معلوم ہو جائے۔ کبھی کبھار کوئی قوی قرینہ اس کے خلاف موجود ہو تو سمجھا جا سکتا ہے کہ سوال کرنے سے کچھ معلوم کرنا مقصود نہیں بل کہ سوال کسی اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ بعض مواقع پر صحابہ کرامؓ سے رسول اکرم ﷺ نے کوئی سوال پوچھا تو جواب معلوم نہ ہونے پر اُنہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا ہی ہے اور اگر اس سوال کا جواب ہماری دینی رہنمائی کے لئے ہے تو اللہ تعالیٰ ایسی باتوں پر اپنے رسول ﷺ کو ضرور مطلع فرماتا ہے اور پھر وہ ہمیں بھی ضرور مطلع فرمائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ آپ ﷺ کو عالم جمیع ما کان و ما یکون اور حاضر و ناظر سمجھتے تھے۔

بعض احادیث میں ہے کہ جب مردے کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس سے ایک سوال یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ ماتقول فی ھذالرجل یعنی ''تو اس آدمی (حضرت محمد ﷺ) کے بارے میں کیا کہتا ہے''؟ تاہم اکثر احادیث میں یہ مضمون اس طرح ہے من ربك وما دینك ومن نبیك یعنی ''تیرا رب کون ہے، تیرا دین کیا ہے اور تیرا نبی کون ہے؟'' اس طرح کی روایات سے رسول اللہ ﷺ کا حاضر و ناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اگر آپ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں تو قبر میں تشریف لانے کا کیا معنی؟ نیز اگر آپ ﷺ صرف مسلمانوں کی قبروں میں تشریف لے جاتے ہیں تو آپ کا ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا ثابت نہ ہوا۔ اگر آپ ﷺ کفار کی قبروں میں بھی تشریف لے جاتے ہیں تو لازم آئے گا کہ کسی کو بھی برزخی عذاب نہ ہو۔ آپ ﷺ جہاں موجود ہوں اللہ کا عذاب وہاں نہیں آتا۔ مزید برآں یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی دنیاوی حیات طیبہ میں صحابہ کرامؓ کی قبروں میں کیوں تشریف نہیں لے جاتے تھے؟ اوپر روایات مذکور ہو چکی ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے بتائے بغیر آپ ﷺ کو فوت ہونے والوں کا علم نہ ہو سکا۔ صحابہ کرامؓ نے جن فوت ہونے والوں کو خود ہی دفن کر دیا تھا تو آپ ﷺ نے صورت حال معلوم ہونے پر ان کی قبروں پر جا کر نماز جنازہ پڑھائی۔ پس ماتقول فی ھذالرجل میں رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ بر بنائے شہرت ہے اور ایسے مواقع پر لسانی محاورات میں اسم اشارہ قریب ''ھذا'' (یہ، اس) وغیرہ کلمات عام مستعمل ہیں۔ مثلاً جب ہرقل شاہ روم کے پاس رسول اللہ ﷺ کا دعوتی نامۂ مبارک پہنچا تو ہرقل اس وقت شہر بیت المقدس میں تھا۔ اتفاقاً حضرت ابوسفیانؓ بھی ان دنوں حالت کفر میں اپنے تجارتی قافلے کے ہم راہ ان ہی علاقوں میں تھے کہ اُنہیں ہرقل کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہرقل نے ابوسفیان سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو متعدد سوالات پوچھے ان میں یہ الفاظ بھی تھے انی سائل عن ھذالرجل کہ میں اس شخص کے متعلق تم سے پوچھ رہا ہوں۔ ہرقل عیسائی تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو حاضر و ناظر نہیں سمجھتا

تھا۔ بیت المقدس، مدینہ منورہ سے طویل فاصلے پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ مدینے میں تھے، ہرقل کے سامنے نہیں تھے لیکن وہ آپ کے متعلق ''ھذ الرجل'' (یہ شخص، اس شخص) کے کلمات استعمال کرتا ہے۔ (۶۶/ الف) ۵ رہجری میں قبیلہ عبدالقیس کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے یہ کہا **بیننا وبینك هذا الحی من كفار مضر** یعنی ہمارے اور آپ کے درمیان مضر کے کفار کا یہ قبیلہ ہے۔ ہم آپ کے پاس صرف حرمت والے مہینوں میں ہی آسکتے ہیں۔ ہمیں دین کی ضروری باتیں اچھی طرح سمجھا دیجئے۔ (۶۶/ ب) دیکھئے قبیلہ مضر کی آبادیاں مدینہ منور سے خاصے فاصلے پر تھیں پھر بھی قبیلہ عبدالقیس کے لوگوں نے ان کے متعلق ''ھذ الحی'' (یہ قبیلہ) کے کلمات استعمال کئے۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کلمات **ماتقول فی هذا الرجل** سے یہ مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارکہ قبر میں میت کے سامنے لائی جاتی ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ آپ ﷺ کو بھی اس کی اطلاع ہو ورنہ جو صحابہ کرامؓ آپ کی دنیوی حیات طیبہ میں فوت ہوئے اور جن کے وفات پانے کی آپ ﷺ کو پہلے اطلاع نہ دی گئی، آپ ان کے احوال سے بے خبر نہ ہوتے۔ ہمارے خیال میں پہلی توجیہہ ہی صحیح ہے کہ **ماتقول فی هذا الرجل** میں آپ ﷺ کی طرف اشارہ آپ کی شہرت کی بنا پر ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جہاں رسول اللہ کی صورت مبارکہ بھی سامنے لائی جائے گی وہاں اللہ کا عذاب نہیں آئے گا حال آں کہ کفار اور فساق وفجار کا عذاب قبر مسلم ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہورہی ہے کہ بعض صحیح رویات کے مطابق قبر میں میت سے یہیں سوال وجواب ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے، تیرا دین کیا ہے اور تیرا نبی کون ہے؟ اس لئے **تقول فی هذا الرجل** کے کلمات سے سوال صرف ان لوگوں سے ہوسکتا ہے جو اپنی دنیوی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کو خوب پہچانتے تھے۔

۱۱۔ سورہ نجم میں ہے فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی (۶۶/ ج) ''تو (معراج کے موقع پر) اس اللہ نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر وحی بھیجی جو بھی بھیجی۔'' یہاں ''ما اوحٰی'' کے کلمات سے وحی کی عظمت کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کو معراج کے موقع پر بہ ذریعہ وحی وہ علوم ومعارف دیئے گئے جن سے آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل ہوا یعنی آپ کے علوم ومعارف تک کسی اور مخلوق کی حتیٰ کہ انبیائے سابقین علیہم السلام کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ بعض غیبی علوم سے ہی حضرات انبیاء علیہم السلام کو مطلع فرماتے ہیں اگر سب کو غیب کلی کا علم دے دیا جائے تو سب کا علم باہم بالکل برابر ہوجائے گا۔ معراج کے موقع پر ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے **السلام علیك ایها النبی**

ورحمة الله وبركاته کا تحفہ آپ ﷺ کو مرحمت ہوا۔ اس سے بھی آپ کی انتہائی قدر ومنزلت کا اظہار مقصود ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ کو معراج کی رات عالم الغیب اور حاضر وناظر بنا دیا گیا تھا۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ معراج سے واپسی پر جب آپ ﷺ نے سارا واقعہ قریش مکہ کو بیان کیا تو وہ آپ سے بیت المقدس کے متعلق پوچھنے لگے کہ وہاں فلاں فلاں چیز کیسی اور کہاں واقع ہے حال آں کہ کسی جگہ جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہاں کی ہر چیز کا تفصیلی علم اور اس کا محل وقوع بھی جانے والے کو معلوم ہو جائے یا ذہن میں پوری طرح محفوظ رہے۔ آپ ﷺ کو وہاں لے جانے کی یہ غرض تھی بھی نہیں۔ مشرکین نے ناحق آپ کا مذاق اُڑانا اور آپ ﷺ کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ آپ کا ارشاد ہے فكربت كربة ماكربت مثله قط (۶۷/الف) ''میں اتنا پریشان ہوا کہ اس سے پہلے کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا تھا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو کچھ دیر کے لئے آپ ﷺ کے سامنے کر دیا اور آپ ﷺ اسے دیکھ دیکھ کر مشرکین کے سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے رہے۔ (۶۷/ب) اس سے صاف معلوم ہوا کہ واقعہ معراج سے آپ ﷺ حاضر وناظر نہیں ہو گئے تھے۔ حروف ندا ''یا، ایھا'' وغیرہ اور ضمیر خطاب کا استعمال کلام میں کبھی بہ طور حکایت ہوتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں يَآاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ، يَآاَهْلَ الْكِتَابِ جیسے کلمات کی جب ہم تلاوت کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کفار اور اہل کتاب یہود ونصاریٰ ہماری تلاوت کو سن رہے ہوتے ہیں۔ کبھی حروف ندا سے ندا مقصود نہیں ہوتی خصوصاً اشعار میں اس کا استعمال محض تخیلاتی ہوتا ہے اور کبھی اس سے محض خبر مراد ہوتی ہے مثلاً ''تمہارے نام پر قربان یا رسول اللہ ﷺ'' کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ میری جان آپ پر قربان ہو، سنانا مقصود نہیں ہوتا۔ کبھی اس کا استعمال مجازاً ہوتا ہے جیسے قرآن کریم میں ہے يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادَ اے حسرت بندوں پر حسرت یا افسوس کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی آواز کو سنتی ہو۔ یہاں بھی خبر ہی مراد ہے کہ یہ کفار پر حسرت اور افسوس کا مقام ہے۔ کبھی حرف ندا سے سنانا مقصود ہوتا ہے خواہ منادیٰ قریب ہو یا بعید۔ مثلاً اگر ہم خط میں اپنے دوست کو مخاطب کریں تو وہ ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے خط کئی دنوں کے بعد ملے۔ کبھی منادیٰ قریب نہیں ہوتا لیکن حروف ندا اور صیغۂ خطاب سے اسے اس نیت سے پکارا اور مخاطب کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ندا اور پکار کو اس تک پہنچا دے گا۔ اس وضاحت کے بعد کلمات يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اور تشہد کے کلمات اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ سے رسول اکرم ﷺ کو حاضر وناظر ثابت کرنا درست نہیں رہتا۔ اسی کج فہمی کو دور کرنے کے لئے حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ جلیل القدر صحابہ کرامؓ نے رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد تشہد میں ان کلمات کو یوں کر دیا تھا۔ السلام على النبى

ورحمة الله وبركاته (۶۷/ ج) صحابہ کرامؓ نے یارسول اللہ اور تشہد کے کلمات سے یہ مطلب لیا ہوتا کہ آپ ﷺ حاضر وناظر ہیں تو وہ ایسے (مفروضہ) عقائد کی شدومد سے تبلیغ کرتے نہ کہ تشہد کے کلمات میں تبدیلی کرتے حال آں کہ تشہد کے کلمات ان ہی صحابہ کرامؓ ہی سے تو ہم تک پہنچے ہیں۔

۱۲۔ مروجہ محافل میلاد النبی میں قیام کے وقت رسول اکرم ﷺ فداہ ابی وامی بعض لوگوں کے دعوے کے مطابق واقعی تشریف لاتے ہیں یا نہیں لاتے؟ اگر نہیں تو ان لوگوں کا آپ کی تشریف آوری کے متعلق دعویٰ صحیح نہ ہوا۔ قرآن کریم میں ہے کونوا مع الصادقین (۶۸/ الف) ''تم سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ'' اس طرح کا مضمون کہیں نہیں کہ تم جھوٹوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ اگر آپ ﷺ ان مروجہ محافل میں واقعی تشریف لاتے ہیں تو وہاں موجود لوگوں کو نظر آتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو آپ ﷺ کا جسد مبارک عالم دنیا میں آپ کے اصحابؓ بل کہ کفار ومنافقین کو بھی نظر آتا تھا اب کیوں نظر نہیں آتا؟ جب نظر نہیں آتا تو خاص لمحات پر آپ ﷺ کی تشریف آوری کا علم لوگوں کو کیسے ہوگیا؟ نیز اگر آپ اپنے جسد مبارک کے ساتھ حاضر وناظر ہیں تو حاضر وناظر تو پہلے ہی ہر جگہ موجود ہوتا ہے پھر آپ ﷺ ان خاص لمحات میں کہاں سے تشریف لاتے ہیں؟ اگر (مفروضہ) تشریف آوری کے وقت وہاں موجود سب لوگوں کو یا بعض کو آپ ﷺ واقعی نظر آتے ہیں تو یہ (مفروضہ) رویت ظاہری آنکھوں سے ہوگی یا قلبی رویت ہوگی۔ اگر یہ رویت بہ حالتِ ایمان کسی کو ظاہری آنکھوں سے ہو تو ایسا شخص صحابی رسول ہوگا۔ ابوجہل اور ابولہب جیسے لوگوں نے آپ ﷺ کو بارہا دیکھا تھا لیکن وہ صحابی اس لئے نہیں کہلاتے کہ اُنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اگر یہ ظاہری رویت نہیں بل کہ قلبی رویت ہے تو اس پر شرعی احکام لاگو ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔ اگر لاگو نہیں ہوتے تو یہ قیام کیسا؟ اگر لاگو ہوتے ہیں تو قلبی رویت والے کو بھی لازماً صحابی ہونا چاہئے۔ نیز اس صورت میں بھی لوگوں کا قیام آپ ﷺ کو پسند ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو یہ قیام محبوب کی پسند اور مرضی کے خلاف ہوا۔ ایسی مجلس میں بھلا آپ ﷺ کیوں تشریف لائیں گے؟ اگر کہا جائے کہ قیام آپ کو پسند ہے تو اس کی بھرپور تردید احادیث صحیحہ سے ہو رہی ہے۔ خادم رسول ﷺ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب کوئی اور نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ آپ کو دیکھ کر (آپ کے احترام میں) کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ کیوں کہ اُنہیں معلوم تھا کہ آپ ﷺ اپنے لئے اس قیام کو ناپسند فرماتے ہیں۔ (۶۸/ ب) حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ اپنی لاٹھی کے سہارے باہر تشریف لائے تو ہم احتراماً کھڑے ہوگئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کے احترام میں کھڑے ہوتے ہیں تم ایسے نہ کیا کرو۔ (۶۸/ ج) ہم یہاں کسی کے

لئے قیام کی شرعی حیثیت اور اس کی حدود و قیود اور شرائط کو زیر بحث نہیں لا رہے۔ لیکن یہ تو طے شدہ امر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے لئے صحابہ کرامؓ کا تعظیماً قیام ناپسند تھا۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ کسی کے استقبال کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پاس جانا اور بات ہے اور اپنی جگہ پر رہتے ہوئے احتراماً کھڑے ہونا اور بات ہے، دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً کسی امام کو ایسی مفروضہ قلبی رویت نماز شروع کرانے سے پہلے حاصل ہو جائے اور ایسی روایت پر شرعی احکام بھی مرتب ہوتے ہوں تو کیا رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اس کے لئے امامت نماز درست ہوگی؟ بالفرض ایسی رویت کسی مقتدی کو نماز سے پہلے حاصل ہو جائے تو وہ آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کی بجائے کسی اور کی امامت نماز کو قبول کر سکتا ہے؟ اگر مروجہ محافل میلاد میں ایسی رویت ممکن ہی نہیں بل کہ حقیقی سمجھی جاتی ہے تو مثلاً افضل ترین عبادت نماز میں اور افضل ترین ذکر تلاوت قرآن کے وقت یہ (مفروضہ) رویت کیوں ممکن نہیں؟ نیز کیا آپ ﷺ کی موجودگی میں نہایت بلند آواز سے درود شریف پڑھنا شرعاً درست ہوگا؟ سورۂ حجرات میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے مت بڑھو اور رسول کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو ورنہ تمہارے اعمال برباد ہو سکتے ہیں اور تمہیں اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ (۶۹/الف) کیا چند لوگوں کا جمع ہو کر درود شریف پڑھنے سے آپ ﷺ کو اپنے ہاں اپنی مرضی اور منشا کے مطابق بلا لینا خلاف ادب تو نہیں؟ کیا ان حضرات نے انجیل متیٰ میں حضرت یسوع (عیسیٰ) کا یہ مبینہ قول پڑھا ہے؟ ''کیوں کہ جہاں دو یا تین میرے نام پر اکٹھے ہوں وہاں میں ان کے بیچ میں ہوں۔'' (۶۹/ب) یاد رہے کہ عیسائیوں کی موجودہ اناجیل محرف ہیں اور عیسائی حضرت عیسیٰ کو اپنے خود ساختہ عقائد کی بنا پر خدا، عالم الغیب، مختار کل اور حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔ الغرض اس طرح کے بیسیوں اشکالات پر کچھ غور کرنا چاہئے۔ رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے واقعات، آپ کی معاشرت و اخلاق، اور آپ ﷺ کی صحیح پاکیزہ تعلیم نہ کہ مرطوع روایت کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا یقیناً محمود و مطلوب اور باعث برکت ہے لیکن اعتقادی بگاڑ اور محدثات و بدعات کی آمیزش سے صورت حال یک سر بدل جاتی ہے جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کا خالص قمری تقویم میں مہینہ رمضان المبارک ہے، ربیع الاوّل ہرگز نہیں۔ ربیع الاوّل اس لئے مشہور ہو گیا کہ قریش مکہ کی ان دنوں تقویم قمری نہیں بل کہ یہودی طرز پر قمریہ شمسی تھی جس میں مہینوں کے نام وہی محرم، صفر تا ذی الحجہ تھے۔ اس تقویم کے بعض سالوں میں سال کے بارہ مہینوں میں تیرہویں مہینے کا اضافہ کیا جاتا تھا جسے نسی کا یا کبیسہ کا مہینہ کہا جاتا تھا تاکہ قمری مہینے شمسی تقویم کے مہینوں کی طرح ایک ہی موسم میں آتے

رہیں۔ رسول اللہ ﷺ ۸ رمضان المبارک ۵۵ قبل ہجرت کو پیدا ہوئے۔ قمریہ شمسی تقویم کی تاریخ ۸ ربیع الاوّل ۵۳ قبل ہجرت قمریہ شمسی تھی۔ دن سوم وار تھا۔ جیولین عیسوی تقویم میں تاریخ ۴ نومبر ۵۶۹ عیسوی تھی۔ ہم ان تمام امور کو مجلّہ ہذا کے گزشتہ متعلقہ شماروں میں نہایت محکم دلائل سے بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ (۶۹/ ج) اس قمریہ شمسی تقویم کو رسول اللہ ﷺ نے خطبات حجۃ الوداع میں ہمیشہ کے لئے منسوخ فرمایا اور خالص قمری تقویم کو بہ حال فرمایا جو پہلے بھی مدینہ منورہ اور اس کے گردونواح میں رائج تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا یوم وفات یقیناً اور یقیناً ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ ہجری قمری بہ روز سوم وار بمطابق مدنی رویت ہلال ہے۔ عیسوی تاریخ ۸ جون ۶۳۲ عیسوی جیولین تھی۔ ربیع الاوّل کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث تو کیا، کوئی ضعیف بل کہ کوئی موضوع حدیث بھی نہیں ملتی۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد کوئی چھ سو سال تک امت مسلمہ اس مروجہ عید میلاد النبی ﷺ سے قطعاً ناآشنا رہی۔ کیا حقائق واضح ہو جانے کے بعد بھی اس پر اصرار مناسب ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کے یوم وفات کو (معاذ اللہ) عید کا دن ٹھہرایا جائے؟ اگر ایسی کسی عید کی شرعاً گنجائش ہو سکتی ہے تو یہ ۸ رمضان المبارک کو ہونی چاہئے لیکن یہ تو روزوں کے ایام ہیں اس لئے یکم شوال کی عید الفطر میں ہی رسول اللہ ﷺ فداہ ابی وامی کی ولادت باسعادت کی عید بھی مضمر ہے۔ فتدبر وتشکر

ج: سورۂ رحمٰن کی ابتدائی آیات یوں ہیں اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ o ''رحمٰن نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا کیا، اسے بیان سکھایا۔'' اگر اصرار کیا جائے کہ ان آیات میں انسان سے صرف رسول اکرم ﷺ ہی مراد ہیں اور بیان سکھانے سے مراد یہ ہے کہ آپ کو علم ماکان ومایکون سکھا دیا گیا تو یہ تفسیر سب کو بہ سروچشم قبول ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ، نزول قرآن کے زمانے اور مستقبل کی بہت سی خبریں دی گئی ہیں اور ہم نے قرآن کریم کی نمایاں وجہ اعجاز ''اخبار عن المغیبات'' کے تحت اہل کتاب کے ساتھ علمی مباحث میں اسے قدرے تفصیل سے بیان بھی کیا ہے۔ (۷۰/ الف) اختلاف علم ماکان ومایکون میں نہیں بل کہ علم جمیع ماکان ومایکون میں ہے۔ اگر یہاں سے جمیع (سب) کا لفظ نکال دیا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ سورۂ رحمٰن کے نزول کے بعد اگر رسول اکرم ﷺ عالم الغیب اور حاضر وناظر ہو گئے تھے تو بعد میں نزول وحی کی ضرورت ہی کیا تھی؟ نیز ان آیات کی مذکورہ تفسیر پر اصرار سے اور ''الانسان'' سے یہاں رسول اکرم ﷺ کو مراد لینے سے یہ بھی بہ خوبی معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ انسان کامل یعنی بشر کامل ہیں اور نور وبشر کے جھگڑے محض زیب داستان کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ضمناً بشریت رسول کی بھی وضاحت

ہو جائے۔ ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے نور سے، جنات کو نار (آگ) سے اور انسان کو خاک سے پیدا فرمایا ہے۔ ہمارے ابا جی حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا تو نوری ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ خاک سے پیدا ہونے والے آدمؑ کو (احترام وتعظیم کے طور پر) سجدہ کریں۔ (۷۰/ب) کیوں کہ سجدۂ عبادت غیر اللہ یعنی مخلوق کے لئے کبھی بھی جائز نہیں ہوا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مسجود ملائک بنا کر نور پر خاک کی فضیلت سب پر ظاہر فرمادی۔ جنات کے سردار ابلیس نے از راہِ تکبر اس تعظیمی سجدے سے انکار کیا اور وجہ یہ بیان کی کہ میں آگ سے اور آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے میں اسے سجدہ کیوں کروں؟ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ملعون قرار دیا کہ اس نے مٹی کو اور مٹی سے پیدا ہونے والے انسان کو حقیر اور اپنے آپ کو برتر جانا۔ الغرض بہ حیثیت مجموعی جب کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مشرکین مکہ اور دیگر قبائل عرب کا رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر بڑا اعتراض یہ تھا کہ رسول ہم جیسا انسان ہے۔ انسان کیسے رسول ہوسکتا ہے؟ اسی طرح کا اعتراض سابقہ انبیاء علیہم السلام پر بھی لوگوں نے کیا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو (ان لوگوں سے) کہہ دے کہ اگر زمین پر فرشتے چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتے کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔ (۷۰/ج) جب انبیاء علیہم السلام کے مخالفین نے کہا ان انتم الا بشر مثلنا'' کہ تم تو ہماری طرح کے انسان ہو'' تو ان پیغمبروں نے اس کی تردید نہیں فرمائی بل کہ صاف صاف اور برملا یہ کہا اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۷۱/الف) ''بے شک ہم تمہاری طرح کے انسان ہی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (منصب نبوت پر فائز کرنے کے لئے) احسان فرماتا ہے۔'' یہاں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے کلمات ہیں، ''مثل البشر'' کے کلمات نہیں لائے گئے جس سے اس فاسد تاویل کا دروازہ کھلے کہ پیغمبر انسانوں کی طرح، بشری اوصاف کے مالک تو ہوتے ہیں لیکن خود بشر نہیں ہوتے۔ جب پیغمبروں کے مخالفین نے یہ کہا تھا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تو ہرگز ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم انسان نہیں بل کہ انسانی اوصاف رکھنے والی کوئی اور مخلوق ہو۔ یہ تاویل اس لئے بھی فاسد ہے کہ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی بہ جائے پیغمبروں کے لئے صرف لفظ ''بشر'' لا کر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا تعلق نوع انسانی سے ہے۔ مثلاً مشرکین مکہ جو طرح طرح کے معجزات رسول اللہ ﷺ سے طلب کرتے تھے، سورۂ بنی اسرائیل میں ان کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے قُلْ سبحان ربی هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۷۱/ب) ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میرا رب (ہر عیب سے) پاک ہے (وہ اپنی قدرت کاملہ سے جو معجزہ چاہے میرے ہاتھ پر ظاہر کرے) میں تو

صرف ایک انسان رسول ہوں۔'' یہ بھی قطعاً غلط ہے کہ پیغمبر اپنے آپ کو تواضعاً بشر کہہ سکتے ہیں لیکن دوسرے لوگ اُنہیں بشر نہیں کہہ سکتے۔ سورۂ کہف میں ہے قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۷/ ج) ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میں تم جیسا ایک انسان ہی ہوں (فرق یہ ہے کہ میں صاحب وحی رسول ہوں چناں چہ) میری طرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔'' جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی پیغمبر سے یہ کہے کہ تم لوگوں سے فلاں بات کہہ دو، فلاں بات بتا دو تو یہ باتیں اسی لئے تو کہی جاتی ہیں کہ لوگ بھی اُنہیں اپنی زبانوں پر لائیں خواہ ان باتوں کا تعلق پیغمبر سے ہو یا دوسروں سے ہو، اور خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق سے ہو۔ اگر لوگ ان باتوں کو زبان پر لانے کے مجاز ہی نہ ہوں تو پیغمبر کو ایسا حکم دینا کہ یہ بات لوگوں سے کہہ دو، (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ایک عبث کلام ہوگا اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ دعا اور استغفار کے کلمات کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ دعا اور استغفار کے آداب میں یہ شامل ہے کہ اپنی معمولی سے معمولی غلطی کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ اس لئے پیغمبر اگر اللہ تعالیٰ سے یہ کہے اِنِّيْ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (میں ظالموں سے ہوں) تو یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کا معاملہ ہے۔ دوسرے لوگ پیغمبر کے لئے ایسے کلمات استعمال کرنے کے ہرگز مجاز نہیں ہو سکتے۔ نیز اللہ بڑا ہے، پیغمبر اس کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں بڑا چھوٹے کو جس طرح چاہے مخاطب کرے لیکن عقل سلیم کا بدیہی فیصلہ ہے کہ چھوٹے اس طرح کے کلمات بڑوں کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے فرمایا اِنِّيْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ (۲۷/ الف) ''میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں اپنا شمار کرانے سے باز رہے۔'' یعنی تیرا اپنے کافر یا منافق بیٹے کے حق میں مجھ سے سفارش کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ دوسرے لوگوں کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ بھی حضرت نوحؑ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) نادان کہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی پیغمبر کو کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ تو لوگوں سے کہہ دے کہ میں تمہاری طرح کا (معاذ اللہ) ظالم ہوں، نادان ہوں وغیرہ۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو صاف الفاظ میں بشر قرار دیا ہے اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ سے واضح اعلان کرایا ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کا بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ (۲۷/ ب) ''اور ان لوگوں نے (پیغمبروں کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔'' یہاں مکر سے مراد خفیہ تدبیر ہے۔ یہ اردو زبان والا مکر نہیں ہے جسے فریب اور دھوکے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (۲۷/ ج) اور وہ (منافقین) اللہ کو (بہ زعم خویش) دھوکہ دیتے ہیں اور

اللہ اُنہیں دھوکہ دے گا۔'' یعنی وہ اُنہیں ان کے دھوکے کی قرار واقعی سزا دے گا۔ یہ صنعت مشاکلت ہے اور دنیا بھر کی زبانوں میں رائج ہے۔ قرآن کریم کے ایسے مضامین کا بھلا پیغمبر کو کلمہ ''قل'' کے ذریعے دیئے جانے والے ایسے کسی حکم سے کیا تعلق ہے کہ لوگوں کو فلاں بات کہہ دو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو صاف حکم دیا کہ اپنی زبان سے لوگوں سے یہ کہہ دے کہ میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں لیکن مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ تو لوگوں کے لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ پیغمبر ہماری طرح نوع انسانی سے ہی تعلق رکھتا ہے البتہ منصب نبوت پر فائز ہونے سے وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز ہو کر اتنے اونچے مقام اور مرتبے کا مالک ہے کہ ہم جیسے لوگوں کی ناقص عقلیں اس کا تصور کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اس پر نہایت فخر اور خوشی ہے کہ نوع انسانی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ ہمارے انسانی بھائی ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو ان کی مخاطب اقوام کا بھائی کہا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ (۷/۶۵ الف) خود رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنا بھائی قرار دے کر ہمیں لازوال مسرت وشادمانی سے ہم کنار کیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے بعض کلمات یہ ہیں **وردت انا قد رأینا اخوانا قالوا اولسنا اخوانك یا رسول الله قال انتم اصحابی و اخواننا الذین لم یأتوا بعد** (۷/۳ ب) ''میری خواہش ہے کہ کاش ہم نے اپنے بھائیوں کو دیکھا ہوتا، صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میرے صحابی ہو اور ہمارے بھائی وہ مسلمان ہیں جو بعد میں آئیں گے (ابھی پیدا نہیں ہوئے)''۔ پس ہمیں یہ کہنے میں نہایت خوشی محسوس ہوتی ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نوع انسانی سے تعلق رکھنے کی بنا پر ہمارے بھائی ہیں اور ہمیں راہِ ہدایت دکھانے اور ہمارے مربی ومعلم ہونے کی بناء پر ہمارے (روحانی) باپ بھی ہیں اور منصب نبوت کی بنا پر ناقابل تصور حد تک بلند مقام اور مرتبے پر فائز ہیں۔ ہرگز اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے نہیں روکا کہ ہم رسول اکرم ﷺ کو بشر اور بھائی کہیں۔ بلاشبہ آپ بشر کامل بھی ہیں اور نورِ کامل بھی ہیں ان میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا انتہائی لچر بل کہ مضحکہ خیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ بہ حکم الٰہی بہ غرض تواضع اپنے آپ کو اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے کلمات سے بشر کہہ سکتے ہیں لیکن دوسروں کو یہ اجازت نہیں۔ بھلا صحیح عقائد کے اظہار میں ایسی تواضع اور انکسار کا کیا جواز ہے جس سے عقائد ہی مبہم اور مشتبہ ہو جائیں؟ تواضع اور انکسار کا یہ مضحکہ خیز فلسفہ تو نصاریٰ کا ہے ان کے خیال میں گویسوع مسیح (حضرت عیسیٰ) خدا اور خدا کے بیٹے تھے لیکن اُنہوں نے اپنے آپ کو خدائی سے خالی کر کے ایک فرماں بردار خادم کی طرح از راہِ

تواضع یہودیوں کے ہاتھوں صلیب کی موت گوارا کی تھی۔ (۳۷/ج)

رسول اکرم ﷺ کو نور من نور اللہ کہنے کا اگر مطلب یہ ہے کہ آپ سراپا نور ہیں تو درست ہے۔ پیغمبر کا تعلق نوع انسانی سے ہوتا ہے اور با اعتبار وصف وہ نور بھی ہے لیکن اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نور کا حصہ اور جز ہیں تو یہ وہی شرک ہے جس میں نصاریٰ مبتلا ہوئے کہ اللہ کی صفت کلام بہ قول ان کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسد مبارک میں حلول کر گئی۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ بھی بہ قول ان کے خدائی صفات کے مالک اور خدا ہو گئے لیکن کیا خدا کھانے پینے کا بھی محتاج ہوتا ہے؟ کیا لوگ اسے پکڑ کر مصلوب بھی کر دیا کرتے ہیں (جیسا کہ بہ قول نصاریٰ حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے تھے؟) عیسائی ان مشکل سوالات سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہتے ہیں کہ مبینہ مصلوبیت کے موقع پر خدائی عنصر ان سے الگ ہو گیا تھا۔ عیسائیوں نے ہمیں آج تک ایسا کوئی نظام الاوقات (ٹائم ٹیبل) نہیں دیا جس سے پتہ چلے کہ کب یہ خدائی عنصر حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر جاتا تھا اور کب ان سے الگ ہو جاتا تھا۔ اگر رسول اکرم ﷺ بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اسی طرح اللہ کا جزو یا خدائی صفات کے مالک ہیں تو کیا طائف میں پتھر خدا نے کھائے تھے اور خدا لہولہان ہو گیا تھا؟ کیا غزوۂ احد میں خدا کی پیشانی خون آلود اور زخمی ہوئی تھی اور کیا خدا کے دانتوں کے ایک حصے کو ضرب لگی تھی؟ کیا غزوۂ خیبر میں یہودی عورت نے خدا کو زہر یلا کھانا کھلایا تھا؟ کیا اس زہر سے بقیہ زندگی میں تکلیف اُٹھانے والا خدا تھا؟ فَتَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بشر کہا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ ''کسی بشر کے لئے مناسب نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکم اور (منصب) نبوت دے پھر وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ'' (۳۷/د) اور مثلاً سورۂ انعام میں ہے کہ ''ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جب اُنہوں نے کہا کہ اللہ نے کبھی کسی بشر پر کوئی چیز (یعنی وحی) نہیں اُتاری۔ تو کہہ وہ کتاب کس نے اُتاری جسے موسیٰ لے کر آیا تھا؟'' (۴۷/الف) پس بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کا مطلب ہے کہ میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں۔ سورۂ انعام میں ہے کہ زمین میں جتنے بھی جاندار اور پرندے ہیں وہ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ یعنی تمہاری طرح کے گروہ ہیں۔ یہاں بشر امثالکم ''تمہاری طرح کے انسان ہیں'' نہیں کہا گیا لہٰذا یہ اعتراض انتہائی لچر ہے کہ پیغمبروں کو بشر کہنے والے اپنے آپ کو بندر وغیرہ کیوں نہیں کہتے۔ ہم بلا خوف وخطر اور بغیر کسی شرمندگی کے کہہ سکتے ہیں کہ تمام جان دار خواہ ان کا تعلق کسی بھی نوع سے ہو، ہم انسانوں کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ اُنہیں پیدا کرنے والا، اُن کی ضروریات زندگی کا انتظام کرنے والا اور اُنہیں روزی

پہنچانے والا بھی وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے ہم انسانوں کو پیدا کیا ہے اور جو ہمارا بھی اور ان کا بھی رب ہے۔ سورۂ تغابن میں ہے کہ پیغمبروں کے منکرین نے کہا اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا فَکَفَرُوْا (۴۷/ب) ''کیا ہمیں انسان ہدایت کریں گے؟ تو (یوں) اُنہوں نے کفر کیا۔'' انبیاء علیہم السلام کو بشر قرار دینے سے وہ کافر نہیں ہوئے وہ تو پہلے ہی کافر تھے۔ وہ اس لئے کافر ہوئے کہ ان کے خیال میں بشر پیغمبر نہیں ہوسکتا۔ اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنا میں ھمزۂ استفہام انکار کے لئے ہے یعنی بہ قول منکرین بشر ہادی (پیغمبر) نہیں ہوسکتا۔

عقل سلیم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسانوں کے لئے رسول انسانوں ہی میں سے ہوں تاکہ وہ لوگوں کے سامنے مکمل عملی نمونہ پیش کرسکیں۔ فرشتے انسانی ضرورتوں، مجبوریوں اور کمزوریوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان میں شہوت نہیں، نہ وہ مرد ہیں نہ عورت ہیں۔ نہ وہ کھاتے پیتے ہیں اور نہ ہی دوسرے انسانی عوارض اُنہیں لاحق ہوتے ہیں۔ اس لئے فرشتے انسانوں کے لئے نمونہ عمل نہیں بن سکتے۔ نیز منصب نبوت بہت بڑا منصب ہے جو اشرف المخلوقات انسان ہی کے لائق ہے۔ ملائکہ اور جنات تو حضرت آدم علیہ السلام کو تعظیمی سجدہ کرنے کے پابند کئے گئے تھے۔ دنیا اور اس کی ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی گئی۔ انسان ہی کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا تو انبیاء علیہم السلام بھی انسان ہی ہونے چاہئیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی عاجزی اور انکسار محبوب ہے۔ تکبر سخت ناپسند ہے۔ اگر یہ تکبر اختیاری ہو تو مخلوق کو ذلیل وخوار کردیتا ہے۔ اگر کسی مخلوق میں خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، فطری طور پر انکسار ہو تو اللہ تعالیٰ کی اس پر زیادہ رحمت ہوتی ہے۔ کسی پودے کا بیج اِدھر اُدھر ہوا میں اُڑتا پھرے تو اس کی چنداں قدر و قیمت نہیں۔ لیکن اگر زمین کے نیچے دب کر بے بس اور عاجز ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو اس پر رحم آتا ہے اور وہ اسے تن آور پودا یا درخت بنا دیتا ہے۔ سمندر کا پانی اُچھلتا رہے تو پانی رہے گا لیکن پانی کا قطرہ اگر صدف کے اندر بند ہو کر عاجز و بے بس ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے موتی بنا دیتا ہے۔ معدنی کوئلہ اگر زمین پر بھٹکتا رہے تو کوئلہ ہی رہے گا لیکن اگر زمین کے نیچے عرصہ دراز تک دبا رہے تو اس کی عاجزی اور انکساری پر اللہ تعالیٰ کو رحم آتا ہے اور وہ اسے نہایت قیمتی ہیرا بنا دیتا ہے۔ جنات کی تخلیق آگ سے ہوئی۔ آگ بھڑکتی ہے اور بعض اوقات پانی ڈالنے پر بھی مدھم نہیں ہوتی، فرشتے نورانی مخلوق ہیں۔ نور میں قوت ہے۔ آناً فاناً یہ آسمان سے زمین پر اور زمین سے آسمان پر آتے جاتے ہیں۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ یہ بے چاری عاجزی اور انکسار لئے ہوئے ہے۔ اسے اُڑاؤ بھی تو بھی نیچے آ بیٹھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ طبعی انکسار پسند ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کو اگر مسجود ملائک و جنات بنایا تو آخری نبی سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ کو معراج کے موقع پر اوپر بلایا اور اتنا اوپر بلایا جہاں

نوریوں کے سردار حضرت جبرائیل علیہ السلام کی بھی رسائی ممکن نہ تھی۔ جولوگ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بشریت سے انکار کرتے ہیں وہ غالباً غیر شعوری طور پر ان کی (معاذ اللہ) توہین وتنقیص کرتے ہیں۔ نیز وہ عیسائیوں کے غلط عقائد کو بھی تقویت پہنچاتے ہیں۔ عیسائی یہ کہہ سکتے ہیں کہ دیکھو تمہارے پیغمبر تمہارے کہنے کے مطابق بشر نہیں تھے لیکن ان سے لاکھوں انسان جنہیں تم سادات کہتے ہو پیدا ہو گئے۔ اسی طرح خدا بھی بشر نہیں اگر اس سے اس کا صرف ایک بیٹا لوگوں کی ضرورت کے مطابق یسوع مسیح پیدا ہو گیا تو تم مسلمانوں کو ہم پر اعتراض کا کیا حق ہے؟ بتایئے ان عیسائیوں کو ہم کیسے جھٹلائیں گے؟ دین میں ناحق غلو اور مبالغے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ الغرض حضرات انبیاء علیہم السلام عقل ونقل کی رو سے انسان ہی ہوتے ہیں۔ ان کے اوّلین مخاطب ان کے اپنے ہم قوم اور ہم زبان ہوتے تھے۔ مثلاً سورۂ ابراہیم میں ہے کہ ''ہم نے جو بھی پیغمبر بھیجا وہ ان کی اپنی قوم کی زبان ہی میں بھیجا تا کہ وہ ان کے لئے (وحی کی) تشریح کر سکے۔'' (۴/ج) جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کو روز روشن کی طرح واضح کرنے کا ایسا کامل انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ لوگوں کے لئے نبی کا ہم قوم ہونا اور پیغام الٰہی کا اسی قوم کی زبان میں ہونا اگر ضروری ہے تو بلاشبہ اس کا انسان ہونا اس سے کئی گنا زیادہ ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبر بشری عوارض اور ضرورتوں میں لوگوں کے لئے نمونہ عمل بنیں چناں چہ مثلاً سورۂ فرقان میں ہے کہ ''وہ (پیغمبر) کھانا کھایا کرتے تھے اور (اپنی روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے) بازاروں میں چلتے تھے۔'' (۷۵/الف) اور مثلاً سورۂ رعد میں ہے کہ ''ان (پیغمبروں) کے لئے ہم نے بیوی بچے بنائے۔'' (۷۵/ب)۔

سب سے پہلے روح محمدی کی تخلیق کا یہ مطلب نہیں کہ یہ انسانی روح نہیں تھی۔ یہ انسانی روح ہی تھی جو حضرت آدمؑ کی پشت میں منتقل ہوئی اور آپ ﷺ حضرت آدم علیہ السلام ہی کی نسل سے ہیں۔ سورۂ ملک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کو پیدا فرمایا ہے۔ (۷۵/ج) موت اور زندگی اوصاف و اعراض ہیں۔ کوئی وصف بھی موصوف کے بغیر نہیں ہوا کرتا۔ آیت کا یہ مطلب لینا کہ رسول اللہ ﷺ اوّلین مخلوق ہونے کی وجہ سے موت وحیات سے بالاتر ہیں، قرآن کریم کی معنوی تحریف ہے۔ موت کا ایک معنی عدم محض کا ہے۔ ہر چیز وجود پذیری سے پہلے اسی حالت میں تھی۔ موت کا دوسرا معنی معدوم ہونے کا نہیں بل کہ عالم دنیا سے عالم برزخ میں منتقل ہونے کا ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں لیکن ان کی برزخی زندگی شہدا کی زندگی سے بھی بہت اعلیٰ ہوتی ہے۔ ان کی بیویوں سے کوئی نکاح نہیں کر سکتا اور ان کے مال میں وراثت نہیں چلتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عالم دنیا سے عالم برزخ میں لے جانے والی موت سے وہ مستثنیٰ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

ہے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (۳۰/الف) ''یقیناً تجھے بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔''

بہ حکم الٰہی ملائکہ انسانی لبادے میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے پاس آئے۔ حضرت مریمؑ کے پاس حضرت جبرائیلؑ انسانی صورت میں آئے۔ رسول اکرم ﷺ کی عمر مبارک کے آخری حصے میں حضرت جبرائیلؑ آپ کے پاس ایک اعرابی کی صورت میں آئے۔ صحابہ کرامؓ بھی موجود تھے۔ تاہم ملائکہ بشری عوارض اور اوصاف سے متصف نہیں ہوتے۔ انسانی صورت میں ظاہر ہونے کے باوجود کھانے پینے اور بیوی بچوں کی خواہش نہیں رکھتے۔ حضرت ابراہیمؑ نے انسانی شکل وصورت میں آنے والے ملائکہ کو انسان سمجھ کر ان کے لئے کھانا تیار کیا لیکن فرشتوں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ذوی العقول مخلوق میں ملائکہ، جنات اور انسان ہی شامل ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ جب حضرات انبیاء علیہم السلام فرشتے یا جن نہیں تو لازماً ان کا تعلق عقل رکھنے والی تیسری مخلوق یعنی نوع انسانی ہی سے ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو ماقوق البشر قرار دینا یا آپ کو عقیدے کی خرابی کے تحت نور من نور اللہ قرار دینا دراصل دبی زبان سے یا علانیہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں نصاریٰ کی طرح خدائی صفات کو تسلیم کرنا ہے۔ جو ماقوق البشر ہو، وہ لوگوں کے لئے نمونہ عمل نہیں بن سکتا۔ چناں چہ بہ ظاہر پڑھے لکھے بہت سے لوگ ہمارے علم میں ہیں جن کا پختہ خیال ہے کہ دنیا کا بگاڑ دینی اور اخلاق پستی اور زوال صرف امام مہدیؑ کی آمد پر ہی دور ہو سکتا ہے کیوں کہ وہ مافوق البشر ہستی ہیں۔ ہمارے لئے یہ اصلاح قطعاً ناممکن ہے اس لئے موجودہ صورت حال پر مطمئن رہے بغیر چارہ نہیں اور کسی اصلاحی تحریک کی نہ تو بہ قول ان کے کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے۔ ہمارے لئے بہ قول ان کے یہی کافی اور وزنی ہے کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں ان ماقوق البشر ہستیوں کو حاضر وناظر اور مختار کل سمجھتے ہوئے پکارتے ہیں اور یقین رکھیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہر حال میں یقیناً ہماری نگارش کریں گے کیوں کہ ہمیں ان سے محبت ہے لیکن ان کے نقش قدم پر چلنے کا ہم سے مطالبہ نہیں کرنا چاہئے کہاں ہم نالائق اور کہاں وہ ماقوق البشر ہستیاں!

اللہ تعالیٰ کا کمال اس کی الوہیت (خدا اور معبود ہونے) میں ہے جب کہ مخلوق کا کمال عبدیت (بندہ ہونے) میں ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کامل ترین انسان ہوتے ہوئے عبدیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہونا عبدیت ہے۔ سورۂ نحل میں ہے کہ ''کیا انہوں نے اللہ کی مخلوق کو دیکھا نہیں کہ ہر مخلوق کے سائے دائیں بائیں جھک جھک کر اللہ کو سجدہ کرتے اور عاجزی کا

اظہار کرتے ہیں۔ یقیناً آسمان وزمین کے کل جان دار اور تمام فرشتے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ ذرا بھی تکبر نہیں کرتے۔'' (۶/۷/ب) سجدہ تو عبدیت کا اعلیٰ درجے کا اظہار ہے۔ اگر حضرات انبیاء علیہم السلام زمین پر پیشانی اور ناک رکھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ان کے سایوں کا زمین پر گر کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنا ہرگز ان کے لئے کوئی عیب نہیں کہ کوئی نادانی اور حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا سایہ نہیں ہوتا اور وہ عبدیت کی اس نمایاں علامت سے (معاذ اللہ) محروم ہوتے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق بعض مواقع پر بادل نے آپ ﷺ پر سایہ کئے رکھا تو یہ بہ طور خرقِ عادت ہے۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ تصور کہ پیغمبر کے سائے پر لوگوں کے پاؤں پڑیں گے اس لئے سایہ نہیں ہونا چاہئے، ایک فریب آمیز مغالطہ اور وسوسہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ مسجد نبوی اور دیگر مقامات پر آتے جاتے تھے۔ آپ ﷺ کے قدم مبارک جہاں جہاں پڑتے تھے، بعد میں اگر غیر شعوری طور پر لوگوں کے قدم اسی جگہ پر پڑیں یا کوئی تبرکاً اسی راستے پر چلے تو قطعاً کوئی حرج نہیں۔ یہی حال آپ ﷺ کے سایہ مبارک کا ہے۔ اس میں برکت کی نیت سے کھڑے ہونا اور بیٹھنا ممنوع نہیں ہوسکتا۔ آپ ﷺ کا سایہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ مثلاً مستدرک حاکم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ نماز کے دوران کچھ پیچھے ہٹے۔ نماز کے بعد صحابہ کرامؓ کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے جہنم کو پیش کیا گیا حتیٰ رأیت ظلی و ظلکم یہاں تک میں نے (اس کی آگ کی روشنی میں) اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا۔ (۶/۷/ج) اور مثلاً مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ حضرت زینبؓ سے ناراض ہوکر میرے گھر چلے آئے۔ ایک دن دوپہر کے قریب وہ (اپنے گھر میں) بیٹھی ہوئی تھیں کہ اچانک ایک سایہ دیکھا۔ (دل میں سوچا) اور کہنے لگیں کہ یہ کسی مرد کا سایہ ہے۔ حضور ﷺ تو مجھ سے ناراض ہونے کی وجہ سے میرے گھر نہیں آتے لیکن دیکھا تو واقعی رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہورہے تھے اور یہ آپ کا ہی سایہ تھا۔ فرأت ظله فقالت ان هذا الظل ظل رجل وما یدخل علی النبی صلی الله علیه وسلم فدخل النبی صلی الله علیه وسلم۔ (۷/۷/الف) اسی طرح کی ایک روایت طبرانی کی المعجم الاوسط میں بھی ہے۔

دوسرا حصہ: واقعاتی شواہد: بہ حوالہ سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ

کیا رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے واقعات وحوادث سے قدم قدم پر یہ واضح ہوتا ہے یا نہیں کہ آپ ﷺ عالم الغیب اور حاضر وناظر نہیں تھے؟ اگر واضح ہوتا ہے تو یہی حق ہے۔ اگر کہا جائے کہ

واضح نہیں ہوتا تو لاتعداد مثالیں اس کی بھرپور تردید کر رہی ہیں۔ ان کا احاطہ اور استیعاب دُشوار ہے تاہم بہت سی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، تاکہ اصل حقیقت بالکل نکھر کر سب کے سامنے آجائے۔

بہ حوالہ مکی زندگی

الف: ایک موقع پر چند سردارانِ قریش آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ اس خیال اور خواہش کے تحت ان سے محوِ گفتگو تھے کہ شاید یہ لوگ اسلام قبول کرلیں۔ دریں اثنا آپ ﷺ کے ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے کوئی دینی مسئلہ پوچھنے کے لئے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ ﷺ کو اس وقت ان کا آنا ناگوار گزرا کیوں کہ وہ مسئلہ بعد میں بھی پوچھ سکتے تھے۔ آپ نے ناگواری سے شکن آلود پیشانی کے ساتھ ان سے منہ پھیر لیا۔ اس پر سورہ عبس کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ مغرور اور متکبر اعیان قریش کی خاطر اپنے نابینا صحابیؓ سے آپ ﷺ کا یہ رویہ خلاف اولیٰ اور نامناسب ہے۔ (۷۷/ب) اس سے معلوم ہوا کہ آپ عالم الغیب ہوتے تو اپنے نابینا صحابی کی آمد پر ناخوش نہ ہوتے۔ حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم عالم الغیب ہوتے تو وہ بھی اس موقع پر حاضر خدمت نہ ہوتے۔

ب: حضرت جبرئیل جب وحی لاتے تو رسول اللہ ﷺ وحی کے کلمات کو جلدی جلدی دہرانے لگتے تاکہ یادداشت میں محفوظ رہیں۔ سورہ قیامہ میں اس سے منع فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو اس (قرآن) کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دے۔ اس کا جمع کرنا اور (تیری زبان سے) اس کا پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔'' (۷۷/ج) آپ عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہوتے، لوحِ محفوظ پر آپ ﷺ کی نظر ہوتی تو یہ صورت حال کیوں پیش آتی؟

ج: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ معراج کی رات میری ملاقات حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے ہوئی تو قیامت کے وقت کے بارے میں باہم تذکرہ ہوا۔ پہلے حضرت ابراہیم نے پھر حضرت موسیٰ نے قیامت کے متعلق کہا لا علم لی کہ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ بات حضرت عیسیٰ تک پہنچی تو اُنہوں نے بھی یہ جواب دیا اما وحبتها فلا يعلم بها احد الا الله (۷۸/الف) ''اس (قیامت) کے وقوع کی خبر اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان اولوالعزم انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کی بھی تردید نہ فرمائی۔ یہاں یہ تاویل لغو ہے کہ اُنہیں قیامت کا علم تو تھا لیکن بات ایک دوسرے پر ٹالتے تھے تاکہ رسول اکرم ﷺ بھی سمجھ لیں کہ

قیامت کے وقت کے راز کو کسی پر نہیں کھولتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان انبیاء علیہم السلام کا یہی عقیدہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب ہیں یا نہیں تھا؟ اگر نہیں تھا تو یہی بات درست ہے۔ اگر یہی عقیدہ تھا تو اُنہیں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع سے کام لیتے ہوئے اور لاعلم لی کہتے ہوئے آپ ﷺ کو یہ جتانے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس راز کو مخفی رکھا جائے؟ عالم الغیب اور حاضر و ناظر تو اپنے مخاطب کے ظاہر و باطن سے پہلے ہی باخبر ہوتا ہے اسے کسی کے مشورے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ایک بات کا علم رکھنے کے باوجود اس کے متعلق صاف الفاظ میں کہنا لا علم لی کھلا جھوٹ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا دامن اس سے پاک ہے۔ قیامت کے متعلق ان پیغمبروں کے مذکورہ مذاکرے کی اور روایات بھی اسی مفہوم کی موجود ہیں، صرف الفاظ و کلمات کا کچھ فرق ہے۔ (۷۸/ب)

بہ حوالہ مدنی زندگی

۱۔۲۔۳ ہجری کے واقعات

الف: اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اکرم ﷺ کوئی سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ آپ ﷺ کو شدید انتظار رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیت المقدس کی بہ جائے خانۂ کعبہ کو قبلہ ٹھہرانے (تحویل قبلہ) کا حکم کب نازل ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ ''ہم بے شک تیرے چہرے کو (وحی کے انتظار میں) بار بار آسمان کی طرف اُٹھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو (اے پیغمبر!) ہم ضرور بالضرور تیرا چہرہ اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے۔ تو (اچھا) اب تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر ہی دے۔'' (۷۸/ج) آپ ﷺ عالم جمیع ما کان و ما یکون ہوتے تو تحویل قبلہ کے صحیح وقت اور دن کا آپ ﷺ کو پہلے ہی سے علم ہوتا۔ وحی کے شدید انتظار کی بل کہ وحی کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہوتی۔ صحابہ کرامؓ عالم الغیب ہوتے تو ان سے بھی تحویل قبلہ کا صحیح وقت مخفی نہ ہوتا۔

ب: غزوۂ بدر کے جنگی قیدیوں کے متعلق حضرت عمر فاروقؓ کا مشورہ یہ تھا کہ اُنہیں قتل کیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مشورہ یہ تھا کہ اُنہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے پر عمل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ خلاف اولیٰ صورت تھی چناں چہ سورۂ آل عمران میں ہے کہ ''اگر پہلے سے یہ بات مقرر نہ ہوتی (کہ کسی معاملے میں خلاف اولیٰ صورت اختیار کرنے کی اجتہادی خطا پر مواخذہ نہیں ہوگا) تو جو تم نے (ان جنگی قیدیوں سے) بہ طور فدیہ لیا ہے، اس پر تمہیں دردناک عذاب پہنچتا۔'' (۷۹/الف) رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب عالم الغیب ہوتے تو ہرگز

خلاف اولیٰ صورت اختیار نہ کرتے اور مذکورہ آیات کا نزول نہ ہوتا۔

ج: غزوۂ احد میں مسلمانوں کا شدید جانی نقصان ہوا۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ آپ ﷺ نے بعض سردارانِ قریش کے خلاف بددعا کا ارادہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں اس سے یوں منع فرمایا کہ ''(اے پیغمبر!) تیرے اختیار میں کچھ نہیں۔ اللہ چاہے تو ان لوگوں پر رحمت سے توجہ فرمائے اور چاہے تو اُنہیں عذاب دے کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔'' (۷۹/ ب) آپ عالم الغیب ہوتے تو آپ ﷺ کو پہلے ہی سے معلوم ہوتا کہ قریش مکہ کی عظیم اکثریت فتح مکہ کے دن اسلام قبول کر لے گی اور مذکورہ صورت حال پیش نہ آتی۔

د: غزوۂ احد کے بعد اگلے روز غزوۂ حمراء الاسد کے لئے نکلنے والے صحابہ کرام کی اللہ تعالیٰ نے خوب مدح فرمائی ہے کہ غزوۂ احد میں شدید جانی نقصان اُٹھانے، زخمی اور تھکے ماندے ہونے کے باوجود اُنہیں ڈرایا گیا کہ لوگ تمہارے خلاف اکٹھے ہو گئے ہیں تو اُنہوں نے اطمینان سے جواب دیا کہ اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اس پر وہ اللہ کی نعمت اور فضل سے سرفراز ہو کر (غزوہ سے) واپس گھروں میں لوٹے اور اُنہیں (دشمن کی طرف سے) کوئی نقصان نہ پہنچا۔ ان لوگوں نے اللہ کی رضامندی کی پیروی کی اور اللہ ایمان والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ (۷۹/ ج) اگر صحابہ کرامؓ عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہوتے تو ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حالات کا اُنہیں پہلے ہی سے بہ خوبی علم ہوتا۔ اُنہیں پہلے ہی سے معلوم ہوتا کہ دشمن سے جنگ نہیں ہوگی، دورانِ سفر کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ حمراء الاسد میں پڑاؤ ڈالنے پر اُنہیں تجارت میں خوب نفع ہوگا اور اللہ کی خوشنودی اور رضامندی اس پر زائد ہوگی تو ان کیلئے کوئی آزمائش دراصل آزمائش ہی نہ رہتی اور نہ ہی وہ کسی طرح کی مدح و توصیف کے مستحق ٹھہرتے۔ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب ہوتے تو آپ کو بھی سب کچھ پہلے ہی معلوم ہوتا اور اس غزوے کے لئے مدینے سے باہر نکلنے پر آپ ﷺ کے لئے بھی کوئی فضیلت اور اجر ثابت نہ ہوتا۔

واقعات ۴-۵ ھجری

الف: رسول اللہ ﷺ نے صفر ۴ ہجری قمری میں حضرت عاصمؓ بن ثابت کی زیر امارت دس صحابہ کرامؓ کو دشمن کی جاسوسی کے لئے روانہ فرمایا۔ جب یہ لوگ عسفان اور مکہ کے درمیان رجیع نامی ایک چشمے پر پہنچے تو بنولحیان کے لوگوں نے اُنہیں شہید کر دیا اور ان میں سے دو حضرات خبیب بن عدی اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما کو گرفتار کر کے اہل مکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا مکہ والوں نے بعد میں اُنہیں نہایت بے دردی سے شہید کر دیا۔ حضرت عاصمؓ نے بوقت شہادت یہ دعا کی اللھم اخبر عنا نبیك (۸۰/ الف) ''اے اللہ!

ہمارے حال سے اپنے نبی کو مطلع فرما۔'' رسول اللہ ﷺ عالم الغیب ہوتے تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ صحابہ کرامؓ کو آپ ﷺ نے کبھی یہ تعلیم دی ہوتی کہ میں عالم الغیب اور حاضر وناظر ہوں تو حضرت عاصمؓ ہرگز یہ دعا نہ مانگتے کہ اے اللہ! ہمارے اس حال سے اپنے نبی کو باخبر کردے۔ غیب دان اور حاضر وناظر کو کسی سے خبر معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو پہلے ہی باخبر ہوتا ہے۔ ایسے مفروضہ (جھوٹے) عقیدوں کو صحیح سمجھ لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ پر لازماً (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کتمان علم اور عقائد کی صحیح تعلیم نہ دینے کا الزام بھی عائد ہوگا۔ مکی دور کے تیرہ سالوں کو بھی شمار کیجئے تو ۴ ہجری تک کوئی سترہ سال مدت بنتی ہے یعنی اتنے طویل عرصے تک بھی آپ ﷺ نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) عقائد کو اسرار بنائے رکھا کہ اپنے عزیز ترین اصحاب کو بھی ان کی ہوا نہیں لگنے دی۔ کیوں نہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں کو ہی جھوٹا قرار دیا جائے؟

ب: سانحہ بئر معونہ صفر ۴ ہجری قمریہ شمسی کا واقعہ ہے جس میں انہتر صحابہ کرامؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ صحابہ کرامؓ بہترین قاری تھے۔ بہ وقت شہادت انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کی **اللھم ابلغ عنا نبینا انا قد لقیناك فرضینا عنك ورضیت عنا** (۸۰/ب) ''اے اللہ! تو ہماری طرف سے ہمارے نبی ﷺ کو اطلاع پہنچا دے کہ ہماری تجھ (اللہ) سے ملاقات ہوگئی تو ہم تجھ سے اور تو ہم سے راضی ہوگیا۔'' اگر رسول اللہ ﷺ کو غیب دان اور حاضر وناظر سمجھ لیا جائے تو اس پر وہی سنگین اشکالات وارد ہوں گے جن کا ذکر اوپر سانحہ رجیع کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔

ج: حضرت زینبؓ بنت جحش سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح رجب ۵ ہجری قمری میں ہوا۔ بہ روایت صحیحین وغیرہ دعوت ولیمہ میں چند صحابہ کرامؓ مدعو تھے۔ کچھ لوگ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہیں بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس سے آپ کے مشاغل خلل پذیر ہوئے اور آپ ﷺ اس ارادے سے وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے کہ یہ حضرات بھی چلے جائیں گے لیکن وہ آپ کے منشا کو سمجھ نہ پائے اور وہیں حجرے میں بیٹھے مصروفِ گفتگو رہے۔ آپ ﷺ کچھ دیر کے بعد اس خیال سے واپس تشریف لائے کہ یہ لوگ چلے گئے ہوں گے لیکن آپ ﷺ نے اُنہیں وہیں موجود پایا۔ اس مرتبہ یہ حضرات بھی سمجھ گئے کہ ہمارا یہاں دیر تک بیٹھے رہنا رسول اللہ ﷺ کے مشاغل میں خلل پذیر ہوا ہے، اس لئے وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ خادم رسول حضرت انسؓ نے آپ ﷺ کو ان لوگوں کے چلے جانے کی اطلاع دی تو آپ ﷺ وہاں تشریف لائے اور حضرت زینبؓ کے حجرے میں داخل ہوئے۔ (۸۰/ج) اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ غیب دان اور حاضر وناظر نہیں تھے اور نہ ہی حضرت انسؓ آپ کو ایسا خیال کرتے تھے۔ غیب دان اور حاضر وناظر کو کسی بات کی اطلاع کی ضرورت نہیں ہوا کرتی وہ

پہلے ہی سے تمام باتوں اور تمام مناظر سے خوب باخبر اور چشم دید گواہ ہوتا ہے۔

د: ۵ ہجری میں غزوہ بنی مصطلق / مریسیع میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ واپسی میں لشکر سے پیچھے رہ گئیں۔ منافقین کو شرارت کا خوب موقع ملا۔ ان کی انگیخت پر بعض سادہ دل مسلمان بھی صدیقہؓ پر بہتان لگانے میں ملوث ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ سخت پریشان ہوئے۔ حضرت عائشہؓ کو حالات کا قطعاً علم نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی قدر سے بے رخی کو محسوس کرتے ہوئے اجازت لے کر اپنے والدین کے گھر آ گئیں۔ بعد میں اُنہیں اپنے اوپر بہتان لگنے کا علم ہوا تو دن رات رونے دھونے میں گزرنے لگے، کھانا پینا چھوٹ گیا۔ انصارِ مدینہ کا آپس میں جھگڑا بھی ہوا۔ بالآخر سورۂ نور میں حضرت عائشہؓ کی برأت میں آیات نازل ہوئیں۔ بہتان میں ملوث لوگوں پر حد قذف (اسی کوڑے) نافذ کی گئی۔ حضرت عائشہؓ کو گمان تک نہیں تھا کہ وحی متلو (قرآن کریم) میں ان کی برأت میں آیات نازل ہوں گی، جن کی قیامت تک تلاوت ہوتی رہے گی۔ (۸۰/د) اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ اور حضرت عائشہؓ ہرگز غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہرگز ازواج مطہرات اور دیگر اصحاب کو یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ میں غیب دان اور حاضر و ناظر ہوں ورنہ حضرت عائشہؓ وہیں سے صدا لگاتیں **یارسول اللہ! انظر حالنا واسمع مقالنا** کہ اے اللہ کے رسول! ہمارا حال مشاہدہ فرمایئے اور ہماری بات سماعت فرمایئے۔ اُنہیں علم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کو میری پاک دامنی کا سو فیصد یقین ہے اور اُنہیں یقین ہے کہ مجھ سے غیر شعوری طور پر بھی گفتگو یا چہرے اور جسم کے پردے وغیرہ میں ہرگز بے احتیاطی نہیں ہوئی، تو وہ ہرگز رونے دھونے اور سخت رنج و پریشانی کے دن نہ کاٹتیں ورنہ یہی کہنا پڑے گا کہ وہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) دیدہ و دانستہ اداکاری فرما رہی تھیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کو غیب کلی کا علم دیا گیا ہوتا اور آپ حاضر و ناظر ہوتے تو اپنی عزیز ترین اہلیہ کو ہرگز ہرگز یکہ و تنہا چھوڑ کر وہاں سے نہ چل دیتے۔ حضرت عائشہؓ کے پیچھے رہ جانے اور دیگر تمام متعلقات کے مناظر آپ کے سامنے ہوتے۔ آپ ﷺ ہرگز پریشانی کا اظہار نہ فرماتے۔ اگر آپ کو سب کچھ معلوم تھا تو آپ ﷺ پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع اور اداکاری کا الزام عائد ہوگا کہ آپ کی پریشانی، اصحاب سے مشورہ لینا، آپ ﷺ کے مشورہ لینے سے انصار کے قبائل اوس اور خزرج میں باہم جھگڑا ہونا جسے رفع دفع کرایا گیا، حضرت عائشہؓ سے بے اعتنائی کا رویہ وغیرہ سب کچھ محض اوپر اوپر سے دکھلاوے کے طور پر تھا۔ نیز غیر مسلموں کو بھی یہ کہنے کے خوب مواقع حاصل ہوں گے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کو رحمۃ للعالمین قرار دیتے ہیں مگر وہ تو اپنی ازواج کے لئے بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) رحمت ثابت نہیں ہوئے۔ اس صورت میں آپ ﷺ پر یہ الزام بھی عائد ہوگا کہ ۵ ہجری تک آپ کے ظہور رسالت پر

کوئی اٹھارہ سال گزر چکے تھے لیکن اس طویل مدت میں بھی آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرت تک کو یہ تعلیم نہ دی کہ میں غیب دان اور حاضر وناظر ہوں۔ اگر صحابہ کرامؓ بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اداکاری فرما رہے تھے تو پورے دین سے اعتماد اُٹھ جائے گا کسی کو یہ پتہ ہی نہیں چلے گا کہ دین میں بناوٹ اور حقیقت کے درمیان حد فاصل کون سی ہے؟ ان تمام اشکالات اور خبیث نتائج سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ جو لوگ بہ رسول اکرم ﷺ سب ہی انبیاء علیہم السلام کو عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر قرار دیتے ہیں ان ہی کو جھوٹا قرار دیا جائے۔

اسی غزوے کا واقعہ ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اپنے ساتھیوں سے مہاجرین صحابہ کرامؓ کے خلاف ناگفتنی باتیں کررہا تھا جو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے سن لیں اور اپنے چچا کو بتادیں۔ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتائیں تو آپ نے حضرت زیدؓ کو بلوالیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے سارا قصہ آپ ﷺ کو بتایا۔ اس پر آپ نے عبداللہ بن ابی کو طلب کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سمیت حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر جھوٹی قسمیں کھائیں اور یقین دلایا کہ ہمارے متعلق آپ ﷺ سے غلط باتیں کہی گئی ہیں۔ حضرت زیدؓ کہتے ہیں **فکذبنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصدقہ فاصابنی ھم لم یصبنی مثلہ قط** ''اس پر رسول اللہ ﷺ نے مجھے تو جھوٹا قرار دیا اور اسے (عبداللہ بن ابی کو) سچا بنادیا تو مجھے اتنا رنج ہوا کہ ایسا کبھی بھی نہ ہوا تھا'' اور ایک روایت میں ہے **فوقع علی من الھم مالم لقع علی احد** حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ میرے چچا نے بھی مجھے ملامت کی اور میں اتنا شرمندہ ہوا کہ گھر سے باہر نکلنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اس کے بعد سورۂ منافقون نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلا کر فرمایا کہ اے زید! اللہ نے تجھے سچا کردیا ہے۔ (۸۱/الف)

یہاں یہ تاویل قطعاً غلط اور لچر ہے کہ آپ ﷺ کو سب کچھ معلوم تو تھا لیکن آپ حضرت زیدؓ کو یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ مضبوط گواہی کے بغیر مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ہرگز عبداللہ بن ابی کو باعزت بری کرتے ہوئے اسے سچا قرار نہ دیتے اور دیدہ ودانستہ حضرت زیدؓ کو جھوٹا قرار دے کر اُنہیں (معاذ اللہ) ناحق رنجیدہ نہ کرتے۔ لوگوں کو (مفروضہ) صحیح عقائد سے آگاہ رکھنے کے لئے صاف صاف یہ فرماتے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے لیکن زید نے مضبوط گواہی کے بغیر مقدمہ میرے سامنے پیش کیا ہے اس لئے میں عدم ثبوت کی بنا پر مقدمہ خارج کررہا ہوں۔ اگر آپ ایسا کرتے تو منافقین کی حوصلہ افزائی بھی نہ ہوتی اور حضرت زیدؓ کی تعلیم وتربیت بھی ہوجاتی اور آپ ﷺ کی اس تعلیم کو بڑی خوشی سے وہ قبول کرتے نہ یہ کہ شرمندہ اور رنجیدہ ہوکر گھر بیٹھ رہتے۔ نیز قاضی اپنے ذاتی

علم کے مطابق مدعی یا مدعا علیہ کے حق میں یا ان کے خلاف فیصلہ کرسکتا ہے۔ متاخرین فقہا نے اس کے خلاف فتویٰ اس لئے دیا ہے کہ بعد کے ادوار میں قاضیوں میں مطلوبہ دیانت وامانت نہیں رہی۔ ادھر ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دیانت وامانت تو بالاتفاق مسلم ہے۔ الغرض رسول اللہ کو ساری صورت حال کا پہلے علم ہوتا تو سورۂ منافقون کا نزول محض تحصیل حاصل اور بے مقصد ٹھہرتا ہے۔ بے شک صحابہ کرامؓ عادل ہیں لیکن غلط فہمی سے کوئی شخص بھی خلاف حقیقت بات کہہ دے تو اس سے اس کی عدالت ہرگز مجروح نہیں ہوتی اور عربی زبان میں ''کذب'' بہ معنیٰ ''غلط'' (اس نے غلط یا خلاف حقیقت کہا) اکثر آتا ہے۔ الغرض نہ رسول اکرم ﷺ حاضر وناظر تھے اور نہ ہی حضرت زیدؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ آپ کو ایسا سمجھتے تھے۔ امام نسائیؒ وغیرہ کے خیال میں حضرت زیدؓ اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا مذکورہ بالا واقعہ غزوۂ تبوک کے ایام کا ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ بنوابیرق کا ہے جنہوں نے حضرت قتادہؓ بن نعمان کے چچا حضرت رفاعہؓ کے گھر میں نقب لگا کر کھانے کا کچھ سامان اور ہتھیار چوری کر لئے۔ تحقیق وتفتیش سے بنوابیرق چور ثابت ہو رہے تھے۔ حضرت قتادہؓ نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر سارے حالات آپ کو بتائے۔ ادھر بنوابیرق بھی باہم سازش کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی چرب زبانی سے آپ ﷺ کو یقین دلایا کہ قتادہؓ اور ان کے چچا رفاعہؓ نے ہم پر بغیر کسی ثبوت کے چوری کا بہتان لگایا ہے۔ آپ ﷺ نے ان کی باتوں کا اعتبار کرلیا۔ حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب میں آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے ان لوگوں پر چوری کا الزام لگا دیا ہے جنہیں مسلمان اور صالح بیان کیا جاتا ہے۔ قتادہؓ کہتے ہیں کہ اس پر مجھے نہایت رنج ہوا کہ کاش میں اس سلسلے میں حضور ﷺ سے کوئی بات ہی نہ کرتا اور اپنے چچا کو ساری بات بتا دی، ان کے منہ سے نکلا اللہ المستعان (اللہ ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے) اس پر سورۂ نساء کی متعلقہ آیات نازل ہوئیں کہ ''(اے پیغمبر!) ہم نے یقیناً حق کے ساتھ تیری طرف کتاب نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں میں اس کے مطابق فیصلہ کرے جس سے اللہ نے تجھے شناسا کیا ہے اور تو خیانت کرنے والے لوگوں کا حمایتی نہ بن اور اللہ سے استغفار کر، بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے اور تو ان کی طرف سے جھگڑا نہ کر جو اپنی جانوں سے خیانت کرتے ہیں، بے شک اللہ کسی خیانت کرنے والے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا''۔ (۸۱/ب) متعلقہ آیات کا مضمون ہی یہاں ہر طرح کی فاسد تاویل کا قلع قمع کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب اور حاضر وناظر نہیں تھے۔ آپ نے بنوابیرق کی باتوں کا اعتبار کرلیا تب ہی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ تو خیانت کرنے والے لوگوں کا حمایتی نہ بن اور (ان لوگوں کے حق میں فیصلہ

کرنے سے جو نادانستہ خطا ہوئی ہے اس پر) تو اللہ سے استغفار (بھی) کر۔ حضرت قتادہؓ اور حضرت رفاعہؓ بھی آپ ﷺ کو غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے ورنہ اُنہیں قطعاً کوئی رنج نہ ہوتا۔ اگر اُنہیں یقین ہوتا کہ آپ ﷺ کو سب کچھ معلوم ہے اور آپ ہمیں محض یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ مضبوط گواہی کے بغیر مقدمہ قاضی کی عدالت میں لے کر نہیں جانا چاہئے تو وہ اس تعلیم و تربیت کو بہ خوشی قبول کرتے نہ یہ کہ رنجیدہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے مدد کے خواست گار ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع سے کام لے کر بنو ابیرق کو باعزت بری نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خطائے اجتہادی پر استغفار کا حکم دے کر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کوئی اداکاری فرمائی ہے۔

غزوہ مریسیع یا کسی اور غزوے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ لشکر نے ایک جگہ پڑاؤ کیا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہار وہاں گم ہو گیا۔ ہار گم ہونے کی وجہ سے اس جگہ قیام قدرے طویل ہو گیا۔ وہاں پانی کی بڑی قلت تھی۔ لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یہ شکایت بھی کی کہ آپؓ کی صاحب زادی کی وجہ سے سب کو پریشانی ہوئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے غصے کے عالم میں حضرت عائشہؓ کی کوکھ میں کئی ضربات بھی لگائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہار کی تلاش میں حضرت اسیدؓ بن حضیر اور کئی دوسرے صحابہ کرامؓ کو بھیجا لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود ہار نہ ملا۔ بعد میں جب اس اونٹ کو اُٹھایا گیا جس پر حضرت عائشہؓ سوار تھیں تو اچانک ہار اس کے نیچے پڑا مل گیا۔ (۸۱/ ج) اگر رسول اللہ ﷺ کو سب کچھ معلوم تھا تو آپ پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع کے علاوہ لوگوں کو ناحق تکلیف پہنچانے کا بھی الزام عائد ہوتا ہے حال آں کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ واقعے کی نوعیت ہی صاف صاف بتا رہی ہے کہ آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔

ھ: بہ روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ خندق سے فارغ ہوئے، ہتھیار اُتار دیئے اور غسل فرمایا تو حضرت جبرئیل نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ آپ ﷺ نے ہتھیار اُتار دیئے لیکن ہم ملائکہ نے ابھی تک نہیں اُتارے اس لئے آپ ﷺ فوراً ان لوگوں کی طرف نکلیں۔ آپ نے دریافت فرمایا، کدھر؟ جبرئیل نے بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا چناں چہ آپ ﷺ لشکر کے ہم راہ! دھر تشریف لے گئے۔ (۸۲/ الف) آپ ﷺ عالم الغیب ہوتے تو غزوۂ خندق سے فراغت کے بعد ہتھیار نہ اُتارتے اور بنو قریظہ کا رخ فرماتے۔ جبرئیل کو آنا نہ پڑتا اور نہ ہی آپ ﷺ کو ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش آتی کہ کدھر جانا ہے۔ اس جنگ میں تورات کے حکم کے مطابق بنو قریظہ کے لڑنے والے مردوں کو قتل کیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان بچوں میں حضرت عطیہ القرظیؓ بھی تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا کیوں کہ صحابہ کرامؓ کو تردد تھا کہ میں

بالغ ہوں یا نابالغ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے زیر ناف بالوں کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے جب اُنہوں نے میرے زیر ناف بال نہ پائے تو مجھے نابالغ قرار دے کر قتل نہ کیا گیا۔ (۸۲/ب) غیب دان اور حاضر و ناظر لوگوں کے ظاہر و باطن سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ شدید ضرورت اور مجبوری کے بغیر کسی کی ستر کشائی، بے حیائی اور معصیت ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔ غزوۂ بنو قریظہ ذی قعدہ ۵ ہجری قمری کا واقعہ ہے۔ قیدی عورتوں اور بچوں کو حضرت سعد بن زید انصاریؓ کی زیر نگرانی نجد بھیج کر ان کے عوض گھوڑے اور ہتھیار خریدے گئے تھے۔

۳۔۶۔۷ ہجری کے واقعات

الف: قبیلہ عکل اور عرینہ کے کچھ لوگ مدینے میں آئے اور بہ ظاہر اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کر لی۔ مدینہ طیبہ کی آب و ہوا راس نہ آنے پر وہ بیمار پڑ گئے۔ اُنہوں نے اونٹوں کے گلوں کے ساتھ جنگل میں رہنے کی آپ ﷺ سے اجازت چاہی۔ آپ نے اُنہیں اجازت دے دی اور بیت المال کے کچھ اونٹ اور دو چرواہے ان کے ہم راہ کر دیئے۔ تندرست ہونے پر اُنہوں نے ایک راعی (چرواہے) حضرت یسارؓ کو بے دردی سے قتل کر دیا اور بیت المال کے اونٹ لے کر بھاگ نکلے۔ دوسرے راعی نے آ کر آپ ﷺ کو اور صحابہ کرامؓ کو مطلع کیا۔ یہ خبر دن کے ابتدائی حصے میں پہنچی۔ آپ نے ان کے تعاقب میں کچھ لوگ بھیجے جو اُنہیں پکڑ لائے۔ ایک روایت کے مطابق بیس جوانوں کو ان کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا۔ آپ ﷺ کے حکم سے ان غداروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں کیوں کہ اُنہوں نے حضرت یسارؓ کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ (۸۲/ج) یہ واقعہ شوال ۶ ہجری قمری کا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے ورنہ ان ظالم منافقوں اور غداروں کے خبیث عزائم کا اُنہیں پہلے ہی علم ہوتا۔ ان کے بھاگ نکلنے کے تمام مناظر بھی کسی حاضر و ناظر سے مخفی نہیں رہ سکتے تھے۔ تلاش کی بیت سے ان کے تعاقب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ب: ذی قعدہ ۶ ہجری قمری میں رسول اللہ ﷺ اپنے کوئی چودہ سو ساتھیوں کے ہم راہ بہ غرض عمرہ مکہ مکرمہ کے لئے عازم سفر ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ قریش مکہ سے گفتگو کے لئے آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ بعد میں ان کی شہادت کی جھوٹی افواہ پھیل گئی۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے ببول کے ایک درخت کے نیچے بیعت لی کہ حضرت عثمانؓ کا قصاص لئے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اس بیعت پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح میں اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا اور صحابہ کرامؓ کو مستقبل میں بے شمار فتوحات کی بشارتیں بھی سنائیں۔ (۸۳/الف) رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ اگر عالم الغیب اور

حاضر و ناظر بنائے گئے ہوتے تو وہ حضرت عثمانؓ کے شہید کئے جانے کی جھوٹی افواہ کو قطعاً خاطر میں نہ لاتے۔ حاضر و ناظر سے کوئی منظر مخفی نہیں ہوا کرتا۔ اُنہیں پہلے سے پتہ ہوتا کہ قریش مکہ سے کوئی جنگ نہیں ہوگی بل کہ صلح ہو جائے گی تو بیعت رضوان کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور نہ ہی ایسی کسی بیعت پر صحابہ کرامؓ بشارتوں کے مستحق ٹھہرتے۔ پس ۶ ہجری کے اواخر تک بھی رسول اللہ ﷺ نے کسی کو یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ میں حاضر و ناظر اور غیب دان ہوں اور نہ ہی صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کو ایسا سمجھتے تھے۔ قریش مکہ سے جو صلح نامہ حدیبیہ ہو رہا تھا اس کی شرائط بہ ظاہر مسلمانوں کے خلاف نظر آ رہی تھیں اور صحابہ کرامؓ کو سخت ناگوار گزر رہی تھیں۔ معاہدۂ صلح لکھوانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ اُٹھو اور اپنے اپنے قربانی کے جانور ذبح کرو۔ صحابہ کرامؓ اس صلح نامے پر اس قدر غم گین اور رنجیدہ تھے کہ کوئی بھی نہ اُٹھا حتیٰ کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ بات دہرائی مگر ابتدا میں پھر بھی کسی نے تعمیل نہ کی۔ اس پر آپ نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے صائب مشورے پر عمل فرماتے ہوئے کسی کو کچھ کہے بغیر اپنا جانور خود ذبح فرمایا اور سر کے بال منڈوا لئے تو صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے ہدیٰ کے جانور ذبح کر دیئے اور باہم ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے، لیکن کیفیت یہ تھی کہ شدت غم سے شاید وہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے۔ (۸۳/ ب) غور کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے ظہور پر کوئی انیس برس گزر چکے تھے اس طویل عرصے میں آپ ﷺ نے اگر کبھی کسی کو بتایا ہوتا کہ میں عالم جمیع ما کان و ما یکون ہوں اور یہ کہ لفظ ''نبی'' کا معنیٰ ہی یہی ہے تو ہرگز مذکورہ صورت حال پیش نہ آتی۔ آپ غیب دان ہوتے تو پہلے ہی خود اپنی قربانی کا جانور ذبح کرتے۔ آپ ﷺ ہرگز رنجیدہ نہ ہوتے اور نہ ہی ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے کسی مشورے کی آپ کو ضرورت ہوتی۔ عیاں راچہ بیاں۔

صلح نامہ حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اردگرد کے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھجوائے۔ ایک خط مقوقس شاہ مصر کے نام تھا۔ اس نے آپ ﷺ کی خدمت میں کچھ ہدایا اور تحائف بھیجے جن میں حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی تھیں۔ اُنہیں آپ ﷺ نے اپنی باندی بنا لیا۔ ان کا ایک چچازاد بھائی مابور نام کا تھا۔ منافقین نے اس پر (معاذ اللہ) حضرت ماریہؓ سے تعلق کا بہتان لگا دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر حضرت علیؓ اس مابور کی تلاش میں نکلے وہ ایک کنویں میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے پکڑ کر کھینچا تو اس کھینچا تانی میں اس کا تہبند کھل گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ تو پیدائشی خصی اور ہیجڑا ہے۔ حضرت علیؓ نے اسے چھوڑ دیا اور آپ ﷺ کو واقعے کی اطلاع دی۔ آپ نے بہ روایت مسند احمد فرمایا **الشاھد یریٰ مالا یری الغائب** کہ حاضر وہ چیز دیکھ پاتا ہے جو غیر حاضر نہیں دیکھتا۔ (۸۳/ ج) رسول اللہ ﷺ نے یہاں اپنے

آپ کو غائب (غیر حاضر) قرار دیا۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی حضرت علیؓ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں حاضر و ناظر اور غیب دان ہوں کیوں کہ غیب دان کسی تحقیق و تفتیش اور اطلاع کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ حضرت علیؓ غیب دان اور حاضر و ناظر ہوتے تو مابور کی تلاش میں نہ نکلتے اور نہ ہی اس سے یوں الجھتے کہ اس کا ستر کھل گیا۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ رسول ﷺ اور حضرت علیؓ دونوں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع فرما رہے تھے اور یہ کہ حضرت علیؓ خواہ مخواہ مابور کی ستر کشائی کا شوق تھا حال آں کہ عالم الغیب اور حاضر و ناظر سے کسی کے جسم کا کھلا یا چھپا حصہ مخفی نہیں ہوا کرتا۔

ج: غزوہ خیبر جمادی الاولیٰ ۷ ہجری قمری میں ہوا۔ خیبر کی فتح کے کے بعد زینب بنت حارث ایک یہودی عورت خبیث عزائم کے تحت رسول اکرم ﷺ کے پاس بھنی ہوئی بکری کا گوشت بہ طور ہدیہ لے کر آئی۔ جسے اس نے زہر آلود کیا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے لقمہ لیتے ہی اُگل دیا اور فرمایا کہ مجھے یہ ہڈی بتا رہی ہے کہ اسے زہر آلود کیا گیا ہے۔ اس موقع پر آپ ﷺ کے ساتھی حضرت بشر بن معرور رضی اللہ عنہ نے لقمہ نگل لیا تھا جس سے وہ جان بر نہ ہو سکے۔ (۸۴/ الف) بعض روایات کے مطابق اس زہر آلود گوشت سے متعدد صحابہؓ وفات پا گئے۔ (۸۴/ ب) گو اس یہودی عورت کا خود رسول ﷺ کو شہید کرنے کا شیطانی منصوبہ ناکام رہا لیکن آپ ﷺ اس زہر سے مسلسل تکلیف اٹھاتے رہے اور اپنے مرضِ وفات میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ میں نے جب سے خیبر میں بکری کا زہر ملا گوشت کھایا ہے اس کی تکلیف میں برابر محسوس کر رہا ہوں اور اب تو اس زہر سے مجھے اپنی رگِ جان کٹتی محسوس ہو رہی ہے۔ (۸۴/ ج) دیدہ و دانستہ اپنی اور دوسروں کی جان کو بہ اختیار خود ہلاکت میں ڈالنا تو خودکشی اور بدترین معصیت ہے۔ کسی بھی گناہ گار کا ہر گناہ اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے، تب ہی تو وہ اس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر وہ رضا بالقضا کی آڑ میں اپنے گناہ اور جرم کا جواز پیش کرے تو یہ ظلم پر ظلم ہے، کیوں کہ گو ہر کام اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے لیکن وہ کسی بھی معصیت پر ہرگز راضی نہیں۔ اس کی رضا اور مشیت میں فرق ہے۔ رضا بالقضاء کا مطلب تو یہ ہے کہ مسلمان غیر اختیاری مصائب و تکالیف پر صبر کرتا ہوا اللہ کی مشیت پر راضی رہے۔ جو گناہ وہ با اختیار خود کرتا ہے اس پر راضی ہونا رضا بالمعصیۃ (گناہ اور نافرمانی پر راضی ہونا) ہے۔ اسے رضا بالقضاء قرار دینا مفاہمت و حماقت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کا دامن اس سے پاک ہے۔ نہ تو آپ ﷺ نے اپنی نبوت کے ظہور کے کوئی بیس سال بعد بھی کسی کو یہ تعلیم دی تھی کہ میں حاضر و ناظر اور غیب دان بنایا گیا ہوں اور نہ ہی آپ ﷺ کے اصحاب آپ کو ایسا سمجھتے تھے۔ آپ حاضر و ناظر ہوتے تو یہودی عورت کا گوشت کو زہر آلود کرنے کا پورا منظر آپ ﷺ کے سامنے ہوتا اور

غیب دان ہوتے تو اس شیطان صفت عورت کے خبیث عزائم آپ ﷺ سے مخفی نہ رہتے۔

غزوۂ خیبر کے بعد حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے رسول ﷺ سے درخواست کی کہ خیبر میں جو جنگی قیدی ہاتھ آئے ہیں ان میں سے ایک لونڈی مجھے عطا فرما دیجئے۔ آپ ﷺ کی اجازت سے انہوں نے یہودی سردار کی بیٹی صفیہ بنت حیی کو منتخب کرلیا۔ ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ کو مشورہ دیا کہ صفیہ بنت حیی چوں کہ اعلیٰ یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھے اور ایک سردار کی بیٹی ہے اس لئے اسے حضور ﷺ خود اپنے پاس رکھیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس سے سردار یہودی خاتون کی دل شکنی نہ ہو۔ آپ ﷺ نے حضرت دحیہ کو بلا کر فرمایا کہ تم کوئی اور باندی لے لو اور حضرت صفیہ کو آپ نے آزاد کر کے خود زوجیت کے شرف سے مشرف فرمایا کیوں کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اگر آپ ﷺ عالم الغیب ہوتے تو ابتدا ہی سے حضرت صفیہ کو دحیہ کو عطا نہ فرماتے اور نہ کسی کو یہ ضرورت پیش آتی کہ وہ آپ کو مشورہ دے۔ غیب دان اور حاضر و ناظر کو مشورہ دینے کی نہ کوئی جسارت کرتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کے مشورے کا محتاج ہوتا ہے۔ پس صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے متعلق ایسا کوئی عقیدہ نہ رکھتے تھے۔

د: ذی قعدہ ۷ ہجری میں عمرۃ القضاء ہوا۔ ان ہی ایام میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت میمونہؓ بنت حارث سے نکاح فرمایا۔ آپ ایک روز ام المومنین حضرت میمونہؓ کے ہاں تھے۔ آپ ﷺ بہت غم گین اور اداس تھے۔ حضرت میمونہؓ نے عرض کیا کہ میں آج آپ ﷺ کو برابر اداس دیکھ رہی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا اور اللہ کی قسم! انہوں نے کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کیا، پھر دن بھر آپ ﷺ کی یہی کیفیت رہی۔ پھر آپ کو خیال آیا کہ گھر میں کتے کا ایک بچہ ہے۔ آپ کے حکم پر اسے نکال دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اس جگہ پر پانی چھڑکا تو شام کے وقت حضرت جبرائیل حاضر خدمت ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ آپ نے تو کل رات ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ جبرئیل نے جواب دیا کہ ہاں لیکن جس گھر میں کتا اور تصویر ہو اس میں ہم داخل نہیں ہوا کرتے۔ (۸۵/الف) حضرت میمونہؓ سے چوں کہ آپ ﷺ کا نکاح اواخر ۷ ہجری قمری میں ہوا تھا۔ اس لئے یہ واقعہ ۸ ہجری قمری سے پہلے کا نہیں ہوسکتا یا زیادہ سے زیادہ اواخر ۷ ہجری کا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کا واقعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی مروی ہے کہ گھر میں چھپر کھٹ کے نیچے کتے کا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ یہ یہاں کب آ گھسا تو انہوں نے عرض کیا، اللہ کی قسم! مجھے علم نہیں (۸۵/ب) اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔ نہ ہی امہات المومنین حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کو ایسا خیال کرتی تھیں۔ آپ حاضر و ناظر ہوتے تو کتے کے پلے کا

گھر میں گھس آنے کا واقعہ اور پورا منظر آپ ﷺ سے مخفی نہ ہوتا اور کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور نہ ہی آپ ﷺ حضرت جبرائیلؑ کے وقتِ مقررہ پر نہ آنے سے پریشان ہوتے۔

ھ: بہ روایت صحیحین حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ہم راہ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حجرے میں داخل ہوئے۔ (ام المومنین حضرت میمونہؓ، حضرت خالدؓ بن ولید کی حقیقی خالہ تھیں) اس وقت ان کے پاس ایک بھنی ہوئی ضب (گوہ) رکھی ہوئی تھی جسے حضرت میمونہؓ کی بہن حفیدہ بنت حارث نجد سے لے کر آئی تھیں۔ آپ ﷺ نے کھانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہاں موجود ازواج مطہرات میں سے کسی نے کہا کہ جو گوشت تم نے رسول ﷺ کے سامنے رکھا ہے، اس کے متعلق آپ ﷺ کو بتادو کہ یہ ضب (گوہ) کا گوشت ہے۔ آپ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور یہ گوشت تناول نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ جو اور کھانا رکھا تھا وہی کھایا۔ البتہ حضرت خالدؓ نے یہ گوشت مزے سے کھایا (۸۵/ج) ظاہر ہے کہ یہ واقعہ بھی ۸ ہجری سے پہلے کا نہیں ہوسکتا یا یہ بھی زیادہ سے زیادہ اواخرے ہجری کا ہوسکتا ہے۔ اس وقت تک بھی آپ ﷺ غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے ورنہ ضب (گوہ) کے شکار اور اس کے گوشت کو بھوننے اور نجد سے لانے کے تمام مناظر آپ ﷺ کے سامنے ہوتے۔ آپ نے ازواج مطہرات کو بھی ان (مفروضہ اور جھوٹے) عقائد کی تعلیم نہیں دی تھی۔ ضب (گوہ) کے گوشت سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں کہ امم سابقہ میں سے کچھ امتوں کی شکلوں کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کردیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ گوہ ان ہی میں سے ہو۔ (۸۶/الف) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر ہم نے بہت سی گوہیں شکار کرکے ان کا گوشت بھونا اور میں نے بھی ایک بھنی ہوئی گوہ آپ ﷺ کے سامنے لاکر رکھ دی تو آپ ایک لکڑی سے اس کی انگلیاں شمار کرنے لگے۔ پھر فرمایا کہ گزشتہ امتوں میں سے ایک امت کو مسخ کرکے زمین پر رینگنے والے جانور بنادیا گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون سی مخلوق ہے۔ یوں آپ ﷺ نے وہ گوہ نہیں کھائی۔ (۸۶/ب) یہ روایات صاف بتارہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔ ازواج مطہرات اور دیگر صحابہ کرامؓ کو بھی کبھی آپ نے ایسے عقیدے کی تعلیم نہیں دی تھی۔

۴۔۸۔۹ ہجری کے واقعات

الف: غزوہ فتح مکہ کے لئے روانگی کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے سب کو سخت تاکید فرمائی کہ ہماری روانگی کا قریش مکہ کو علم نہ ہونے پائے۔ ایک بدری صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ پر مکہ میں مقیم اپنے اعزہ واقارب کی محبت غالب آ گئی۔ انہوں نے قریش مکہ کے نام خط لکھ کر ایک خاتون کے حوالے کیا

کہ اسے سرداران قریش تک پہنچادو۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے صلے میں قریش مکہ میرے اعزہ واقارب سے حسن سلوک سے پیش آئیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کو بہ ذریعہ وحی اس کا علم ہوا۔ آپ نے کچھ صحابہ کو خاتون کے تعاقب میں روانہ فرمایا کہ روضۂ خاخ پر ایک ہودج نشین عورت تمہیں ملے گی۔ اس کے پاس خط ہوگا وہ لیتے آؤ۔ پتہ چلا کہ یہ خط تو حاطب بن ابی بلتعہ نے بھیجا ہے۔ جواب طلبی پر انہوں نے ساری صورت حال واضح کردی۔ حضرت عمرؓ نے انہیں منافق قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ سے ان کے قتل کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جنگ بدر میں حاضر ہو چکا ہے اور عمر! تمہیں کیا علم؟ ہوسکتا ہے اللہ نے اہل بدر کو دیکھ کر کہا ہو کہ تم لوگ جو چاہو کرو، میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے آبدیدہ ہوکر عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو (اس کے متعلق) بہتر علم ہے۔ (۸۶/ ج) اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کبھی اپنے بدری اصحاب تک کو یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ میں غیب دان اور حاضر وناظر ہوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ بہ طور معجزہ ماضی وحال اور مستقبل کی غیبی خبریں بتایا کرتے تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر جو مشرکین مکہ قتل ہوئے ان کے متعلق آپ ﷺ نے خبر دی تھی کہ فلاں شخص بدر کے میدان میں فلاں جگہ قتل ہوگا اور مثلاً سریہ موتہ کے موقع پر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں ہوتے ہوئے یہ خبر دی کہ جھنڈا زیدؓ نے لیا اور وہ شہید کردیئے گئے۔ پھر جعفرؓ نے لیا اور وہ بھی شہید کردیئے گئے۔ پھر ابن رواحہؓ نے لیا اور وہ بھی شہید کردیئے گئے۔ یہاں تک کہ جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالدؓ بن ولید) نے لیا اور اللہ نے اُن پر فتح عطا فرمائی۔ اب فتح مکہ کی تیاری کے ایام میں آپ ﷺ نے حضرت حاطبؓ کا خط لے جانے والی عورت کی نشان دہی فرمائی۔ اس طرح کے تمام واقعات سے ہرگز کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ آپ ﷺ ہر وقت ہمہ بین اور ہمہ دان ہیں۔ کوئی بات کبھی آپ سے پوشیدہ نہیں رہتی ورنہ حضرت حاطبؓ جیسے بدری صحابی ہرگز اہل مکہ کو خط نہ لکھتے اور حضرت عمرؓ انہیں منافق قرار دے کر آپ ﷺ سے اُنہیں قتل کرنے کی اجازت طلب نہ کرتے۔ غیب دان اور حاضر وناظر سے ایسی اجازت طلب کرنے کی کون جسارت کرسکتا ہے؟

ب: فتح مکہ کے بعد شوال ۸ ہجری قمریہ شمسی میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی جانب تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا۔ اُن کے ہم راہ یہاں مہاجرین وانصار اور بنو سلیم کے کوئی ساڑھے تین سو افراد تھے۔ بنو جذیمہ کے لوگوں نے اسلمنا (ہم اسلام لائے) کی جگہ صبأنا (ہم نے اپنا دین چھوڑ دیا) کہا۔ حضرت خالدؓ نے تحقیق کئے بغیر اُن لوگوں کو قتل کرنا شروع کردیا اور ایک ایک قیدی اپنے ہر ساتھی کے حوالے کرکے اُن سے کہا کہ ہر شخص اپنے قیدی کو قتل کردے۔ اس پر بنو سلیم کے لوگوں نے تو

اپنے قیدیوں کو قتل کر دیا لیکن مہاجرین وانصار نے حضرت خالدؓ کے اس ناروا حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دیگر مہاجرین وانصار نے واپسی پر رسول اکرم ﷺ کو اس حادثے کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ کو سخت رنج ہوا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر دو بار فرمایا، اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا، میں اس سے تیری طرف برأت اختیار کرتا ہوں۔ (۸۷/الف) آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر مقتولین کی دیت اور تمام نقصانات کا معاوضہ ادا فرمایا۔ آپ ﷺ عالم الغیب ہوتے تو حضرت خالدؓ کو پہلے ہی متنبہ فرما دیتے یا اُن کی جگہ کسی اور کو روانہ فرماتے۔ آپ ﷺ حاضر وناظر ہوتے تو بنو جدیمہ کو قتل کئے جانے کا پورا منظر آپ ﷺ کے سامنے ہوتا۔ مہاجرین وانصار کو ضرورت ہی نہ ہوتی کہ واپسی پر آپ کو حالات سے مطلع کریں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کو حاضر وناظر اور غیب دان تصور نہیں کرتے تھے ورنہ وہیں سے پکارتے یارسول اللہ انظر حالنا واسمع مقالنا "یارسول اللہ ﷺ! ہمارا حال ملاحظہ فرمایئے اور ہماری بات سماعت فرمایئے"۔ یوں وہ اس طرح متنازعہ امور میں آپ ﷺ سے ہدایات لے لیا کرتے۔ یا وہ محفل میلاد منعقد کر کے رسول اللہ ﷺ کو اپنے ہاں بلا لیا کرتے، بہ حالتِ قیام درود شریف پڑھ کر ایسے امور میں آپ ﷺ سے رہ نمائی لیا کرتے۔

ج: ذی قعدہ ۸ ہجری قمریہ شمسی میں غزوہ حنین واوطاس سے فراغت پر رسول اکرم ﷺ کئی روز تک جعرانہ کے مقام پر ٹھہرے رہے۔ آپ کو انتظار تھا کہ ہوازن کا وفد تائب ہو کر آ جائے اور اپنے اموال اور قیدی واپس لے جائے۔ کئی دنوں کے شدید انتظار کے باوجود وہ لوگ نہ آئے تو آپ ﷺ نے اموال غنیمت اور قیدی تقسیم فرما دیئے۔ بعد میں ہوازن کا وفد پہنچ گیا۔ بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ ان کے قیدی واپس کر دیئے جائیں۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے اُن کی سفارش فرمائی کہ ان کے قیدی بہ خوشی واپس کر دیئے جائیں تو بہتر ورنہ آئندہ جو سب سے پہلے مال فے حاصل ہوگا اس میں سے ایک کے بدلے چھ دیں گے۔ لوگوں نے کہا، ہم رسول اللہ ﷺ کے لئے بہ خوشی (بلا معاوضہ) ایسا کرنے کو تیار ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا، ہم جان نہ سکے کہ تم میں سے کون دل سے راضی ہے اور کون نہیں لہٰذا تم جاؤ، تمہارے بڑے سردار تمہارے معاملے کو ہمارے سامنے رکھیں گے۔ چناں چہ ان سرداروں نے اپنے اپنے لوگوں سے صلاح ومشورہ کر کے آپ کو اپنی رضامندی سے مطلع کیا۔ (۸۷/ب) اگر آپ عالم جمیع ماکان ومایکون اور حاضر وناظر ہوتے تو آپ کو ہوازن کے وفد کی آمد کے صحیح دن اور وقت کا پہلے ہی سے خوب علم ہوتا۔ آپ کو ہرگز کسی انتظار کی ضرورت پیش نہ آتی اور نہ ہی آپ اموال غنیمت تقسیم فرماتے۔ آپ اپنی لاعلمی ظاہر نہ فرماتے کہ کون دل سے قیدیوں کو واپس کرنے پر راضی ہے اور کون نہیں۔ یہ بھی معلوم

ہوا کہ صحابہ کرامؓ بھی آپ کو غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے ورنہ مذکورہ صورت حال پیش نہ آتی۔

د: رجب ۹ ہجری قمریہ شمسی میں رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک کے لئے روانہ ہوئے۔ اس غزوے میں شرکت کے لئے منافقین آپ ﷺ کے سامنے طرح طرح کے بہانے پیش کر کے غزوے میں شامل نہ ہونے کی رخصت حاصل کرتے رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ میں فرمایا کہ اللہ تجھے معاف کرے، تو نے ان (منافقین) کو (غزوے میں شامل نہ ہونے کی) اجازت ہی کیوں دی یہاں تک کہ تجھ پر سچے لوگ بھی کھل جاتے اور تو منافقوں کو بھی جان لیتا۔ (۸۷/ ج)۔ اگر آپ ﷺ غیب دان اور حاضر و ناظر ہوتے تو منافقین کے ظاہر و باطن سے پہلے ہی پوری طرح باخبر ہوتے۔ یہاں یہ تاویل قطعاً غلط ہے کہ مضحکہ خیز ہے کہ آپ ﷺ کو معلوم تو سب کچھ تھا لیکن آپ منافقین کی پردہ پوشی فرما رہے تھے۔ رب نے فرمایا کہ اے مجرموں کے پردہ پوش، آپ ﷺ نے ان کو رسوا کیوں نہ کیا؟ اس لغو تاویل پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ منافقوں کی پردہ پوشی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئے گی یا معلوم نہیں تھا؟ اگر معلوم نہیں تھا تو آپ ﷺ عالم الغیب نہ ہوئے اگر معلوم تھا تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کو پورا علم بھی تھا کہ آپ ﷺ کی طرف سے منافقین کی یوں پردہ پوشی اللہ کو ہرگز پسند نہیں آئے گی پھر بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) آپ ﷺ اس سے باز نہ آئے۔ اسی سورۂ توبہ میں ہے کہ ''اے نبی! تو کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر، ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا ٹھکانا ہے''۔ (۸۸/ الف) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منافقوں پر سختی کرنے کا حکم دے رکھا تھا نہ یہ کہ ان کی پردہ پوشی کی جائے۔ غزوۂ تبوک کے زمانے کے منافقین کے متعلق اسی سورۂ توبہ میں مزید ارشاد ہے کہ ''تمہارے اردگرد بدوؤں میں منافقین موجود ہیں اور مدینے کے کچھ لوگ بھی نفاق پر ڈٹے ہوئے ہیں، (اے پیغمبر!) تو انہیں نہیں جانتا ہم انہیں جانتے ہیں''۔ (۸۸/ ب) یہاں بھی یہ تاویل نہایت ہی لچر ہے کہ یہ بہ طور محاورہ کہا گیا ہے، جب کسی دوست کے مقابلے میں اس کے دشمن کو ضروری سزا دینی مقصود ہو تو دوست کی طرف مخاطب ہو کر اور دشمن کی طرف تہدیدی نظر اٹھا کر کہا جاتا ہے، تو نہیں جانتا پہ منکر بڑا بے ایمان ہے میں اس کو جانتا ہوں تاکہ دوست سے اپنے علم پر ہی موقوف رکھے اور اس کی سفارش نہ کرے۔ اس مضحکہ خیز اور لغو تاویل پر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ منافقین کے حق میں آپ کی سفارش اللہ کو پسند نہیں آئے گی یا معلوم نہیں تھا؟ اگر معلوم نہیں تھا تو آپ ﷺ عالم الغیب نہ ہوئے۔ اگر معلوم تھا اور پھر بھی آپ ﷺ سفارش پر تلے بیٹھے تھے تو یہ تو کھلی معصیت ہے حال آں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منافقین پر سختی کا حکم بھی دے رکھا تھا۔ سورۂ مائدہ کی ایک آیت کا جز ہے فَتَرَى الَّذِينَ فِي

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" سو تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں بیماری ہے"۔ اس سے یہ سمجھ لینا کہ رسول اللہ ﷺ کو منافقین کے دلوں پر اطلاع تھی، پرلے درجے کی بدفہمی ہے۔ یہاں فَتَرَى کا مفعول الَّذِيْنَ ہے فِيْ قُلُوْبِهِمْ نہیں ہے۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے کہ وہ دوڑ دوڑ کر ان (یہودیوں) میں گھس رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر کوئی مصیبت نہ آپڑے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح دے دے یا اپنے پاس سے کوئی اور چیز لے آئے۔ پھر یہ (منافقین) اپنے دلوں میں چھپائی ہوئی باتوں پر نادم ہونے لگیں گے"۔ (۸۸/ ج) یہاں رسول اللہ ﷺ کو منافقین کی ظاہری علامت بتائی گئی ہے کہ وہ بہانے بہانے سے یہودیوں سے دوستی لگاتے ہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ کو ان کے دلوں پر اطلاع ہے۔ سورۂ توبہ کے مضامین سے خوب واضح ہو رہا ہے کہ آپ کو وحی کے بغیر منافقین کا علم نہیں ہو سکا۔ سورۂ محمد کا نزول پہلے ہو چکا تھا۔ سورۂ توبہ قرآن کریم کی آخری سورتوں میں سے ہے۔ سورۂ محمد میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ منافقین کو ان کے انداز بیان سے پہچان لیا کریں گے۔ عالم الغیب اور حاضر و ناظر کسی منافق کو پہچاننے کے لئے اس کے کسی ظاہری نشان اور اس سے گفتگو کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ وہ تو پہلے ہی سے ہر کسی کے ظاہر و باطن پر مطلع ہوتا ہے۔ پھر یہ بات سورۂ محمد کے نزول کے دنوں کے منافقین کی تھی نہ کہ غزوۂ تبوک کے منافقین سے بھی اس کا کوئی لازمی تعلق تھا۔ غزوۂ تبوک کے ایام میں ہی منافقین نے خفیہ خبیث عزائم اور منصوبوں کے تحت ایک مسجد بنائی اور رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ایک آدھ نماز ہماری مسجد میں پڑھا دیں تو ہمیں برکت حاصل ہوگی اور لوگوں کو اس مسجد میں نماز پڑھنے کی ترغیب بھی ہوگی۔ آپ ﷺ نے وعدہ فرما لیا کہ تبوک سے واپسی پر میں تمہاری تعمیر کردہ مسجد میں نماز پڑھا دوں گا۔ تبوک سے واپسی پر دورانِ سفر بذریعہ وحی آپ ﷺ کو مطلع کیا گیا کہ مسجد بنانے والے منافقین ہیں۔ مسلمانوں کی جاسوسی اور انہیں نقصان پہنچانے کے مذموم مقاصد کے تحت انہوں نے یہ مسجد ضرار بنائی ہے۔ اس لئے آپ ﷺ ہرگز اس میں کھڑے نہ ہوں۔ (۸۹/ الف) آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنے چند اصحاب کو بھیج کر اس مسجد کو مسمار کرایا۔ ان تمام واقعات اور حالات سے بہ خوبی واضح ہے کہ آپ ﷺ غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔ غزوۂ تبوک کے زمانے کے منافقین کا علم آپ ﷺ کو ان ہی ایام میں بہ ذریعہ وحی ہوا۔ پہلے آپ بے خبر تھے۔

ھ: غزوۂ تبوک کے بعد اواخر ۹ ہجری قمریہ شمسی میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی مرا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے مخلص بیٹے کی دل جوئی کے لئے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو یاد دلایا کہ یہ

شخص تو پکا منافق ہے اس کے لئے آپ ﷺ کی طرف سے دعائے مغفرت مناسب نہیں لیکن آپ نے حضرت عمرؓ کی رائے پر عمل نہ فرمایا۔ (۸۹/ب) اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے کبھی بھی حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر اصحاب کو بھی یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ میں غیب دان اور حاضر و ناظر ہوں ورنہ وہ ازخود آپ ﷺ کو جنازہ نہ پڑھانے کا مشورہ دینے کی جسارت ہی نہ کرتے۔ یہ مشورہ ان سے آپ نے طلب نہیں فرمایا تھا بل کہ اُنہوں نے ازخود دیا تھا۔ آپ ﷺ اگر عالم جمیع ما کان و ما یکون ہوتے تو آپ کو پہلے ہی سے علم ہوتا کہ عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھانا اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں آئے گا اور آپ ﷺ کو بہ ذریعہ وحی یوں کہا جائے گا کہ (اے پیغمبر!) تو ان (منافقین) میں سے کسی بھی مرنے والے پر کبھی بھی نماز (جنازہ) نہ پڑھ اور نہ ہی تو اس کی قبر پر کھڑا ہو۔ (۸۹/ج)

واقعات و حوادث ۱۰۔ الھجری

الف: ذی الحجہ ۱۰ ہجری قمری میں حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ قربانی کے جانور اپنے ہم راہ لے آئے تھے۔ اس لئے مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ ادا کرنے کے بعد آپ ﷺ نے احرام نہ کھولا لیکن اپنے اصحاب سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ احرام کھول دو۔ صحابہ کرامؓ کو یہ صورت حال ناگوار محسوس ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ تو احرام باندھے رہیں اور ہم احرام کھول کر آپ کے ساتھ موافقت و یگانگت کے شرف سے محروم رہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے نہایت حسرت سے فرمایا کہ جس بات کا علم مجھے اب ہوا ہے اگر پہلے ہو جاتا تو میں ہدی (قربانی کے جانور) ساتھ لے کر نہ آتا۔ (۹۰/الف) دیکھئے ذی الحجہ ۱۰ ہجری تک بھی آپ ﷺ کو عالم جمیع ما کان و ما یکون نہیں بنایا گیا تھا۔ صحابہ کرامؓ بھی اگر غیب دان ہوتے تو ابتدا ہی آپ سے درخواست کرتے کے جانور اپنے ساتھ لے کر نہ جائیں تا کہ آپ کے ساتھ موافقت و مشابہت سے محروم ہونے کا ہمیں صدمہ نہ ہو۔ اسی حجۃ الوداع کے سلسلے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس سے خوش و خرم نکلے لیکن کچھ دیر کے بعد آپ ﷺ غم گین اور رنجیدہ ہو کر واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں کعبے میں داخل ہو گیا تھا۔ اگر مجھے پہلے سے وہ خیال ہوتا جو اب بعد میں پیدا ہوا ہے تو میں کعبہ میں داخل نہ ہوتا، مجھے خوف ہے کہ میں نے اپنے عمل سے امت پر بوجھ نہ ڈالا ہو۔ (۹۰/ب) یہ واقعات واضح کر رہے ہیں کہ آپ ﷺ غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔ آپ نے خطبات حجۃ الوداع میں رمی جمرات کا طریقہ بتانے کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ حج کے مناسک (احکام اور طریقے) مجھ سے سیکھ لو لعلی لا اراکم بعد عامی ھذا (۹۰/ج) ''شاید میں تمہیں اس سال کے بعد نہ دیکھ پاؤں۔'' حاضر و ناظر تو ہر وقت ہر جگہ ہر چیز کو دیکھتا ہے پس اس روایت سے بھی واضح ہوا کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع

کے آخری ایام تک بھی عالم الغیب اور حاضر و ناظر نہیں تھے۔

ب: رسول اللہ ﷺ نے مرضِ وفات کے ایام میں حضرت علیؓ سے فرمایا کہ کوئی طبق لے کر آؤ جس پر میں وہ باتیں لکھوادوں کہ امت اس کے بعد گمراہ نہ ہو۔ حضرت علیؓ کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں میرے آنے تک آپ ﷺ انتقال ہی نہ فرما جائیں اس لئے اُنہوں نے عرض کیا کہ حضرت! میں یوں ہی ان باتوں کو یاد رکھ سکتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے نماز، زکوٰۃ کی وصیت اور غلاموں اور لونڈیوں سے حسن سلوک کی تاکید فرمائی۔ (۹۱/ الف) اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنی دنیوی حیات طیبہ کے آخری ایام تک میں بھی حضرت علیؓ کو ہرگز یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ میں عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہوں۔ ورنہ حضرت علیؓ ہرگز آپ ﷺ کو از خود کوئی مشورہ دینے کی جسارت نہ کرتے۔ رسول اللہ نزول قرآن کے پورا ہونے پر عالم الغیب ہو چکے ہوتے تو ابتدا ہی سے زبانی وصیت فرما دیتے اور طبق لانے کا حکم نہ دیتے۔ حضرت علیؓ عالم الغیب ہوتے تو اُنہیں آپ ﷺ کے انتقال کے صحیح وقت کا پہلے ہی سے پورا علم ہوتا۔

اپنے مرض وفات میں رحلت سے چار دن پہلے جمعرات کے دن مغرب تک رسول اللہ ﷺ تمام نمازیں مسجد نبوی میں خود ہی پڑھاتے رہے۔ عشاء کے وقت مرض میں بہت شدت تھی۔ حضرت عائشہؓ سے آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم نے کہا، نہیں یارسول اللہ! سب آپ ﷺ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے لئے لگن میں پانی منگوا کر اس سے غسل فرمایا پھر نماز کے لئے اُٹھنے پر آپ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی۔ افاقہ ہونے پر پھر یہی سوال و جواب ہوا لیکن اس مرتبہ بھی اُٹھنے پر غشی طاری ہوگئی۔ اس کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ بالآخر آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کہلوا بھیجا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہؓ کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ اس مرض میں اگر رسول اللہ ﷺ انتقال فرما گئے تو لوگ ابوبکر صدیقؓ کے متعلق بدشگون نہ ہوں اس لئے اُنہوں نے آپ ﷺ سے متعدد مرتبہ خواہش ظاہر کی کہ چوں کہ ابوبکرؓ رقیق القلب ہیں، مسجد میں آپ ﷺ کی عدم موجودگی اور آپ کی جگہ امامت نماز کے وہ متحمل نہیں ہوسکیں گے، اس لئے یہ فریضہ کسی اور کو سونپ دیا جائے لیکن آپ ﷺ نے ہر مرتبہ انکار فرمایا۔ وحی خفی یا قرائن کی بنا پر آپ ازواج مطہرات کے مذکورہ وسوسے کو بھانپ گئے اور فرمایا کہ تم سب یوسف والیاں ہو۔ (۹۱/ ب) یعنی جس طرح حضرت یوسفؑ کے سلسلے میں مصری خواتین عزیز مصر کی بیوی کو مطعون کر رہی تھیں کہ وہ اپنے غلام کے دام محبت کی اسیر ہوگئی ہے اور دل میں خود بھی حضرت یوسفؑ پر فریفتہ تھیں، اسی طرح حضرت عائشہؓ اور ان کی ہم نوا دیگر ازواج مطہرات کے دل میں یہ تھا کہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق بدشگونی سے کام

نہ لیں۔ ادھر اتفاق یہ ہوا کہ مسجد نبوی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن زمعہ نے حضرت عمرؓ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ چناں چہ حضرت عمرؓ نماز پڑھانے لگے اور پہلی تکبیر کہی۔ ان کی آواز بلند تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے آواز سن کر فوراً حجرے سے سر مبارک نکالا اور غصے سے فرمایا، نہیں نہیں! لوگوں کو نماز صرف ابن ابی قافہ (ابوبکر صدیقؓ) ہی پڑھائیں گے۔ (۹۱/ج) یہ تمام واقعات و حالات روز روشن کی طرح واضح کر رہے ہیں کہ اپنی دنیوی زندگی کے آخری ایام تک بھی آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ کو ہرگز یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ میں عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر بنا دیا گیا ہوں۔ غیب دان تو سب لوگوں کے ظاہر و باطن سے بہ خوبی باخبر ہوتا ہے۔ وہ ہرگز اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی شخص از خود اسے کوئی مشورہ دینے کی کوشش کرے۔ حضرت عائشہؓ رسول اکرم ﷺ سے بھلا کیسے بار بار درخواست کر سکتی تھیں کہ ابوبکرؓ کی بہ جائے کسی اور کو فریضہ امامت سونپا جائے جب کہ دل میں یہ تھا کہ لوگ کہیں میرے والد ابوبکرؓ کے متعلق بدشگون نہ ہوں۔ صحابہ کرامؓ عالم الغیب ہوتے تو انہیں پہلے ہی سے معلوم ہوتا کہ حضرت عمرؓ کو امامت نماز کے لئے آگے بڑھانا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا رسول اللہ ﷺ کو ناگوار گزرے گا۔ نہ تو حضرت عمرؓ آگے بڑھتے اور نہ ہی دیگر صحابہ کرامؓ انہیں آگے بڑھنے دیتے۔ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب اور حاضر وناظر ہوتے تو آپ کو پہلے ہی سے معلوم ہوتا کہ میں مسجد میں نہیں جا سکوں گا۔ آپ ﷺ اس کے لئے متعدد مرتبہ کوشش نہ فرماتے۔ آپ بار بار لوگوں سے یہ بھی نہ پوچھتے کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے۔ آپ ﷺ حاضر وناظر ہوتے تو حضرت عمرؓ کا امامت نماز کے لئے آگے بڑھنے کا عمل آپ ﷺ سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ آپ ابتدا ہی سے انہیں منع فرما دیتے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امامت صلوۃ کے ایام میں صرف ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے نماز باجماعت پڑھی۔ امام ابوجعفر طحاوی حنفیؒ کے دعوے کے مطابق یہ جہری نماز تھی۔ آپ ﷺ کی آہٹ پا کر جب ابوبکر صدیقؓ پیچھے ہٹے تو آپ ﷺ نے امامت کا فریضہ انجام دیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ صرف مکبّر رہے۔ آپ ﷺ نے وہیں سے قرأت شروع فرمائی جہاں تک ابوبکر صدیقؓ قرأت کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں امام طحاویؒ لکھتے ہیں لان تلك الصلوة كانت صلوة يجهر فيها بالقرأة ولولا ذالك لما علم رسول الله ﷺ الموضع الذى انتهى اليه ابوبكرؓ من القرأة ولا علم من خلف ابى بكر (۹۲/الف) ''اس لئے کہ یہ وہ نماز تھی جس میں قرأت بلند آواز سے کی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو اور ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدیوں کو یہ علم نہ ہو پاتا کہ ابوبکر کہاں تک قرأت کر چکے ہیں۔'' یہ تمام باتیں واضح کر رہی ہیں کہ مکمل نزول قرآن کے بعد اپنے مرض وفات کے آخری ایام میں بھی رسول اللہ ﷺ عالم جمیع

ماکان وما یکون نہیں تھے۔ صحابہ کرامؓ بھی عالم الغیب نہ تھے۔ امام طحاویؒ کا عقیدہ بھی یہی ہے۔

دیگر متفرق واقعات

الف۔ حضرت ابوہریرہؓ سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر جاتا ہوں اور اپنے بستر پر کھجور پڑی ہوئی پاتا ہوں۔ ثم اخشیٰ ان تکون صدقة فالقیها (۹۲/ب) ''پھر مجھے یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں یہ کھجور صدقہ کی نہ ہو تو میں اسے (کھائے بغیر) رکھ دیتا ہوں۔'' یہاں یہ تاویل مردود ہے کہ آپ ﷺ کو سب کچھ معلوم ہوتا تھا لیکن آپ امت کو تقویٰ کا سبق دینا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے فاخشی ''پھر مجھے ڈر ہوتا ہے'' کے کلمات صادر نہ ہوتے۔ اسی طرح کی ایک اور روایت مذکورہ تاویل کو بیخ وبن سے اُکھاڑ رہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے نہایت بے چینی سے گزاری۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کس چیز نے آپ ﷺ کو جگائے رکھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے ایک افتادہ کھجور پائی اور اسے کھالیا۔ پھر مجھے زکوٰۃ کی کھجوروں کا خیال گزرا جو ہمارے پاس تھیں فلا ادری أمن ذالك كانت التمرة اومن تمر اهلی فذالك اسهرنی (۹۲/ج) ''تو میں نہیں جانتا کہ کیا ان ہی زکوٰۃ کی کھجوروں میں سے یہ کھجور تھی یا ہمارے گھر کی کھجوروں میں سے تھی تو اسی (پریشانی) نے مجھے جگائے رکھا۔'' دیکھئے آپ کو سب کچھ پہلے سے معلوم ہوتا تو پریشان کیوں ہوتے، رات بھر بیدار کیوں رہتے اور یہ کیوں فرماتے کہ مجھے یہ علم نہیں کہ یہ زکوٰۃ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور تھی یا ہمارے گھر کی کھجوروں میں سے تھی؟

ب: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے جوتے پہن کر نماز میں مصروف تھے کہ اچانک آپ ﷺ نے اپنے جوتے اُتار کر بائیں جانب رکھ دیئے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا۔ نماز کے بعد آپ ﷺ کے دریافت فرمانے پر ہم نے عرض کیا کہ آپ کی اقتدا میں ہم نے بھی جوتے اُتار دیئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تو جوتے اس لئے اُتارے تھے کہ جبرئیل نے آکر مجھے بتایا تھا کہ ان میں قذر (نجاست) لگی ہوئی ہے۔ (۹۳/الف) اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ غیب دان اور حاضر وناظر نہیں تھے ورنہ حضرت جبرئیل کے ذریعے آپ ﷺ کو مطلع کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جوتے میں نجاست لگ جانے کا منظر آپ ﷺ سے مخفی نہ ہوتا اور پہلے ہی سے جوتوں کو نجاست سے صاف کر لیتے۔ بل کہ نجاست سے آلودہ ہی نہ ہونے دیتے۔ یہاں یہ لغو تاویل نہیں چل سکتی کہ آپ کو علم تو تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کے جوتے میں ذرا سی نجاست بھی پسند نہ تھی۔ قذر کا معنی ''ذرا سی نجاست'' نہیں ہے۔ نیز کیا آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کو میرے جوتے میں ذرا سی بھی نجاست

پسند نہیں یا معلوم نہیں تھا؟ اگر معلوم نہیں تھا تو آپ ﷺ عالم الغیب نہ ہوئے۔ اگر معلوم تھا تو یہ کہنا پڑے گا کہ آپ ﷺ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اللہ کی پسند اور ناپسند کا کوئی احساس نہیں تھا۔ پس ایسی تاویل مردود ہے۔ بعض حالات مثلاً جنگ، سفر وغیرہ یا کسی اور ضرورت کے تحت جوتوں سمیت نماز درست ہے۔ عام حالات میں بلاضرورت ایسا کرنا خلاف ادب ہے گو نماز ہو جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو پاکیزہ وادی میں آ پہنچا ہے، اس لئے اپنے دونوں جوتے اُتار دے۔ (۹۳/ب) یہاں قرآن کریم میں یہ مضمون نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مبارک جوتوں میں کوئی نجاست لگی ہوئی تھی۔ ہم اپنے گھروں میں قالینوں اور پلنگوں پر جوتوں سمیت نہیں بیٹھتے خواہ جوتے پاک ہی کیوں نہ ہوں۔ مساجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہیں۔ وہ ہمارے گھروں سے کہیں زیادہ احترام کی مستحق ہیں۔

ج: رسول اکرم ﷺ ام المؤمنین حضرت زینبؓ بنت جحش کے پاس کچھ دیر ٹھہرتے اور وہاں شہد نوش فرماتے۔ امہات المؤمنین حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کو سوکنیں ہونے کی حیثیت سے یہ ناگوار گزرا۔ اُنہوں نے ایک منصوبے کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپ ﷺ تشریف لائیں تو آپ سے یہ کہا جائے کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آ رہی ہے۔ مغافیر ایک قسم کی ناخوش گوار بو والی گوند ہوتی ہے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے زینب کے گھر سے شہد پیا ہے۔ اب میں قسم کھاتا ہوں کہ نہیں پیوں گا لیکن یہ بات تم کسی کو مت بتانا۔ (۹۳/ج) آپ ﷺ نے رازداری کی یہ بات حضرت حفصہؓ سے کہی تھی جو اُنہوں نے حضرت عائشہؓ کو جا کر بتا دی اور آپ کے راز کی حفاظت نہ کر سکیں۔ سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا کہ ''اے نبی! جو اللہ نے تیرے لئے حلال ٹھہرایا ہے تو اسے (استعمال نہ کر کے) کیوں حرام ٹھہراتا ہے (کیا) تو اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔ (۹۴/الف) آپ ﷺ کو قسم کا کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت حفصہؓ سے جو غلطی ہوگئی تھی اس کا بہ ذریعہ وحی خفی آپ ﷺ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے میرا راز ظاہر کر دیا ہے۔ وہ حیران و پریشان ہو کر بولیں، آپ ﷺ کو کس نے بتایا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے علیم و خبیر (اللہ تعالیٰ) نے بتایا ہے۔ (۹۴/ب) اس سے بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ غیب دان اور حاضر و ناظر نہیں تھے ورنہ اپنی ازواج کی مذکورہ خفیہ تدبیر کا اور اس مقصد کے لئے ان کی باہم مجلس اور مشاورت کا آپ ﷺ کو پہلے ہی سے علم ہوتا۔ آپ شہد کو استعمال نہ کرنے کی قسم نہ کھاتے اور اس اجتہادی غلطی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اگر حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کا یہ عقیدہ ہوتا کہ آپ ﷺ عالم جمیع ما کان و ما یکون ہیں تو بھلا وہ خفیہ تدبیر

کیسے کرتیں کہ آپ ﷺ حضرت زینبؓ کے پاس زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا کریں؟ حضرت حفصہؓ آپ سے کیوں حیران ہوکر پوچھتیں کہ آپ ﷺ کو کیسے پتہ چلا کہ میں نے آپ کا خانگی راز ظاہر کردیا ہے؟ عموماً اپنے منہ کی بو خود اپنے آپ کو محسوس نہیں ہوا کرتی، اسی لئے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے مذکورہ تدبیر کی۔ اگر کوئی کج بحثی سے کام لیتا ہوا اصرار کرے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے منہ کی بو کبھی بھی غیر محسوس نہیں ہوا کرتی تو وہ بہ زعم خویش اپنے آپ کو حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہے۔ الغرض اگر یہ مفروضہ عقائد صحیح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر و ناظر تھے تو یہاں چار شقیں ہی ممکن ہیں۔ یا تو رسول اللہ ﷺ نے ان (مفروضہ) عقائد کو تادم آخر (معاذ اللہ) اسرار بنائے رکھا، صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہرات کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے دی یا آپ ﷺ اور اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) تصنع اور بناوٹ سے کام لیا کرتے تھے یا آپ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور اللہ تعالیٰ تینوں فریق (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اداکاری فرمایا کرتے تھے یا یہ مفروضہ عقائد قطعاً جھوٹے ہیں، ایسے عقائد کی تعلیم ہرگز آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو نہیں دی۔ ہر سلیم الطبع اور صحیح الحواس شخص اس آخری شق کو ہی درست قرار دے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن قرآنی آیات واحادیث سے مذکورہ عقائد بہ زعم خویش ثابت کئے جاتے ہیں، ایسا استدلال قطعاً باطل اور مردود ہے۔ یہ سب آیات اور احادیث صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کو بھی معلوم تھیں بل کہ ان ہی کے ذریعے امت کو منتقل ہوئی ہیں، انہوں نے کبھی ان سے ایسے عقائد کشید نہیں کئے تھے۔

بہ حوالہ برزخی واخروی زندگی

الف: متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر آپ کی برزخی زندگی میں امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے زمین میں چلتے پھرتے ہیں اور امت کا صلوۃ وسلام مجھے پہنچاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میری (دنیوی) زندگی تمہارے لئے بہتر ہے تم مجھ سے (دین کے متعلق) باتیں کرتے ہو اور (ان کے جواب میں) تم سے بات ہوتی ہے۔ اور میری وفات (بھی) تمہارے لئے بہتر ہے۔ مجھ پر تمہارے اعمال پیش کئے جائیں گے تو جو اچھے عمل ہوں گے ان پر میں اللہ کی حمد کروں گا اور جو برے عمل ہوں گے ان پر میں تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ (۹۴/ج) علامہ ہیثمیؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کے راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ بعض روایات کے مطابق یہ عرض اعمال

روزانہ ہوتی ہے۔ کیا یہ عرض اعمال اجمالی ہے یا تفصیلی؟ اسے تفصیلی نہیں قرار دیا جا سکتا کیوں کہ اگر یہ عرض اعمال، تفصیلی ہے اور یہ بھی مفروضہ قائم کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ بہ قول بعض ولادت مبارکہ کے وقت سے، بہ قول بعض معراج کے موقع پر اور بہ قول بعض قرآن کریم کے مکمل نزول کے بعد عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر بنا دیئے گئے تھے تو جو پہلے ہی سے عالم الغیب اور حاضر وناظر ہو، جسے ماضی حال اور مستقبل کے پل پل کی خبر ہو تو اس پر امت کے اعمال پیش کرنا کیا تحصیل حاصل اور سراسر عبث کام نہیں ہے؟ عرض اعمال کا مقصد رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ امت مسلمہ کے نیک اعمال پر میں اللہ کی حمد اور برے اعمال پر ان کے لئے اللہ سے استغفار کروں گا۔ اگر پہلے ہی سے آپ ﷺ عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے آپ ﷺ پر عرض اعمال (معاذ اللہ) تحصیل حاصل اور بیگار مشغلہ ٹھہرتا ہے چوں کہ لوگوں کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے اس لئے ملائکہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر لوگوں کے اعمال پیش کئے جانے کی کوئی صحیح روایت موجود ہو تو کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ عرض اعمال اس لئے ہو سکتی ہے کہ ملائکہ کو یہ بتایا جائے کہ کون سے نیک اعمال کا کتنا اجر وثواب مرتب ہوگا اور کون سے برے اعمال کو عفو ذنوب کی صورت میں اعمال ناموں سے ساقط کرنا ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ پر یہ عرض اعمال اگر تفصیلی ہو تو ایک ہی مرتبہ آپ پر اعمال پیش کرنا کافی اور وافی ہوتا۔ اس عمل کے اعادے اور تکرار کی حاجت ہی نہ رہتی۔ مزید برآں یہ عرض اعمال صرف امت مسلمہ کی ہے۔ پوری امت کی نہیں کیوں کہ آپ ﷺ کفار کے حق میں استغفار نہیں کریں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ عرض اعمال اجمالی ہے۔ اس سے آپ ﷺ کا عالم الغیب اور حاضر وناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا بل کہ اس کے برعکس ان (مفروضہ اور خود تراشیدہ) عقائد کی نفی ہوتی ہے۔

ب: صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آپ ہمیں (اپنی امت کے لوگوں کو) بہ روز قیامت پہچان پائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں تم حوض کوثر پر آؤ گے اور وضو کے اثر سے تمہارے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن اور چمکتے ہوں گے۔ (۹۵/الف) عالم الغیب اور حاضر وناظر ہر کسی کے ظاہر و باطن سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ اسے کسی کو پہچاننے کے لئے ہرگز اس کی کسی ظاہری علامت کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو یہ تعلیم دی ہوتی کہ میں عالم جمیع ما کان وما یکون اور حاضر وناظر ہوں یا کسی بھی مرحلے پر بنا دیا جاؤں گا تو وہ ہرگز آپ ﷺ سے یہ نہ پوچھتے کہ کیا آپ ہمیں قیامت کے دن پہچان لیں گے۔ آپ بھی ان کے سوال کے جواب میں آثار وضو کا حوالہ نہ دیتے بل کہ فرماتے کہ میں غیب دان اور حاضر وناظر کی حیثیت سے ہر کسی کو بہ خوبی پہچانتا ہوں گا۔ یہ بھی

معلوم ہوا کہ جن بعض قرآنی آیات اور احادیث سے غیب کلی کے علم پر استدلال کیا جاتا ہے، وہ سراسر غلط اور مردود ہے۔ ان میں سے کئی آیات مکی ہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے ان آیات کی یہی تفسیر فرمائی ہوتی تو مذکورہ سوال و جواب کی سرے سے نوبت ہی نہ آتی۔ بالفاظ دیگر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ ان آیات کا یہ مطلب نہیں لیتے تھے۔ آثارِ وضو سے افرادِ امت کو پہچاننے کا یہ مضمون متعدد احادیث میں آیا ہے۔

ج: حوض کوثر والی احادیث پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حوضِ کوثر پر آنے والے بعض لوگ ایسے ہوں گے جنہیں حوض سے ہٹا کر جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ فرمائیں گے کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں اور بعض روایات میں اصیحابی (میرے چند اصحاب) کا کلمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض روایات کے مطابق خود اور بعض روایات کے مطابق بہ ذریعہ ملائکہ یہ جواب دے گا کہ تجھے علم نہیں کہ اُنہوں نے بعد میں کون کون سے نئے کام کئے یعنی بدعتوں میں ملوث ہوئے۔ ان لوگوں سے آپ ﷺ کی لاعلمی کو کہیں انك لاتدری "بے شک تو نہیں جانتا" کہیں انك لاعلم لك (بے شک تجھے علم نہیں) کے کلمات سے ظاہر کیا گیا ہے۔ (۹۵/ب) صحیحین میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ایک روایت میں هل شوت ماعملوا بعدك "کیا تجھے علم ہے کہ تیرے بعد اُنہوں نے کیا کچھ کیا ہے؟" اور حضرت اسماءؓ ہی کی دوسری روایت میں اما شوت ماعملوا بعدك کے کلمات لائے گئے ہیں۔ (۹۵/ج) حوض کوثر کی تمام روایات سے بہ خوبی واضح ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عالم آخرت میں بھی عالم جمیع ما کان و ما یکون نہیں ہوں گے۔ یہاں یہ تاویل صریحاً غلط ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) ذہول و نسیان ہو جائے گا۔ اوّلاً اگر آپ ﷺ پر عالم برزخ میں امت کے اعمال روزانہ تفصیل سے پیش کئے جاتے رہے ہوں تو ربیع الاوّل ۱۱ ہجری سے ربیع الاوّل ۱۴۳۱ ہجری تک ۱۴۲۰ سالوں کے دن پانچ لاکھ تین ہزار دو سو ایک بہ حذف کسر بنتے ہیں (یعنی اس مفروضے کو ماننے کی صورت میں عالم آخرت کے ان مراحل تک آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) لاکھوں مرتبہ ذہول ہو چکا ہوگا، کیوں کہ ایک مرتبہ کی تفصیلی عرض اعمال کے بعد دوسری مرتبہ کے تفصیلی عرض اعمال کی تو سرے سے ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ثانیاً غیب دان اور حاضر و ناظر صرف ماضی اور مستقبل کے احوال و کیفیات سے ہی پوری طرح باخبر نہیں ہوتا بل کہ وہ حال کے تمام واقعات و حوادث اور ظواہر و بواطن سے لازماً پوری طرح باخبر ہوگا۔ حوض کوثر پر آنے والے لوگوں کے باطنی نفاق و کفر یا بدعات و محدثات کی وجہ سے ان کی قلبی ظلمت کسی غیب دان اور حاضر و ناظر سے ہرگز مخفی رہ ہی نہیں سکتی لہٰذا ذہول کا عذر قطعاً غلط اور لایعنی قرار پاتا ہے۔ ثالثاً اگر آپ ﷺ کو مختار کل قرار دینے کے مفروضے کو درست سمجھ لیا جائے تو مختار کل ذہول و نسیان کو استحضار میں بدلنے یعنی حافظے میں

دوبارہ لے آنے پر پوری طرح قادر ہوگا۔ رابعاً حوض کوثر والی بعض احادیث میں یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرتدین اور مبتدعین کے متعلق آپ ﷺ کو بتایا جائے گا کہ آپ کے بعد یہ لوگ برابر ایڑیوں کے بل دین سے پھرتے رہے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے نیک بندے (حضرت عیسیٰ) کی طرح عرض کروں گا وکنت علیہم شہیدا مادمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم وانت علی کلی شیء شہید (۹۶/الف) ''میں ان پر (عالم اختیاری اسباب کے تحت) گواہ رہا جب تک میں ان کے اندر موجود رہا پھر جب تو نے مجھے اُٹھالیا پھر (میں اس پر حضور ناظر اور نگہبان نہیں تھا بلکہ) تو ہی ان پر نگہ بان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔'' اگر آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) اس موقع پر ذہول ہوگا تو سورۂ مائدہ میں مذکور حضرت عیسیٰ کا قول آپ ﷺ کو کیسے یاد رہے گا؟ پس مذکورہ تاویل غلط ہے اور اس تاویل میں تو رسول اللہ ﷺ کی (معاذ اللہ) اہانت کا پہلو بھی موجود ہے۔ یہ تاویل بھی قطعاً غلط اور ناقابل قبول ہے کہ حضرت اسماءؓ والی ایک روایت کے کلمات اما شعرت میں ھمزۂ استفہام انکار کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو علم تو ہے کہ یہ لوگ آپ کے بعد ایڑیوں کے بل دین سے پھرتے رہے۔ اوّلاً حضرت اسماءؓ ہی کی دوسری روایت میں اما شعرت کے کلمات ہیں ان میں ما استفہامیہ موجود نہیں۔ ثانیاً حوض کوثر کی بیسیوں روایات میں انك لاتدری ماحدثوا بعدك کے کلمات ہیں۔ بعض روایات میں انك لاعلم لك کے الفاظ میں جو مذکورہ تاویل کا قلع قمع کر رہے ہیں۔ ثالثاً حضرت اسماءؓ کی جس روایت میں اما شعرت ماحدثوا بعدك کے کلمات میں ان کے فوراً بعد عبارت یوں ہے۔ واللہ مایرجوا بعدك یرجعون علیٰ اعقابہم یعنی ''اللہ کی قسم! یہ تیرے بعد لگاتار اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے لوٹتے رہے۔'' اگر آپ ﷺ کو پہلے ہی سے سب کچھ معلوم تھا تو یہ جملہ درمیان میں لانا قطعاً بے مقصد قرار پاتا ہے۔ رابعاً اما شعرت کے کلمات سے قطعاً یہ لازم نہیں آتا کہ جو بات مخاطب کو بتائی جارہی ہے اسے پہلے سے اس کا علم بھی ہو۔ مثلاً بہ روایت حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ کے کم سن نواسے سیدنا حضرت حسن بن علیؓ نے زکوٰۃ اور صدقے کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اپنے منہ میں ڈال لی تو آپ ﷺ نے سختی سے تنبیہ فرمائی۔ اما شعرت انا لانا کل الصدقۃ (۹۶/ب) ''کیا تجھے علم نہیں کہ ہم (بنو ہاشم) صدقہ نہیں کھایا کرتے (یہ ہمارے لئے حلال نہیں ہے)'' ظاہر ہے کہ کم سن حضرت حسنؓ کو یہ شرعی مسئلہ پہلے معلوم نہیں تھا۔ چناں چہ امام نوویؒ شارح مسلم نیاما شعرت کی شرح میں لکھا ہے ھذہ اللفظۃ تقال فی شیء الواضح التحریم ونحوہ وان لم یکن المخاطب عالمابہ (۹۶/ج) ''یہ لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کا حرام ہونا واضح ہو اگرچہ مخاطب کو اس کا علم نہ ہو۔''

فتح مکہ کے بعد عموماً اور پھر غزوۂ تبوک کے بعد خصوصاً، جزیرۃ العرب کے اطراف واکناف سے مختلف قبائل کے وفود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ ان میں سے کئی قبائل بعد میں مرتد ہو گئے جن کے خلاف خلیفہ اوّل سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جہاد کیا۔ ان ہی لوگوں میں سے بعض کو رسول اللہ ﷺ پہچانتے ہوں گے اس لئے حوض کوثر کی بعض روایات میں آپ کا ارشاد ہے کہ میں اُنہیں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے۔ بعد کے زمانے کے وہ اہل بدعت جو حد کفر تک نہ پہنچے ہوں اُنہیں آپ ﷺ آثار وضو سے پہچان لیں گے۔ یہ پہچاننا ان کے ظاہر سے ہوگا۔ نہ کہ آپ ان کے باطن سے بھی آگاہ ہوں گے چناں چہ جب آپ ﷺ کو بتایا جائے گا کہ اُنہوں نے آپ کے بعد (دین کو) بدل ڈالا تھا تو آپ ﷺ فرمائیں گے کہ دور ہٹو، دور ہٹو۔ (۹۷/الف) احادیث حوض بڑی تعداد میں کوئی تیس سے زائد صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں اسی لئے اہل علم نے اُنہیں متواتر قرار دیا ہے۔ (۹۷/ب) پس ان احادیث کو ضعیف قرار دے کر ان سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ صحیح بخاری کی احادیث حوض میں ایک حدیث کے کلمات ہیں **بینما انا نائم** یعنی میں سو رہا تھا کہ اچانک ایک گروہ گزرا یہاں تک کہ جب میں نے اسے پہچان لیا تو ایک شخص نے میرے اور ان کے درمیان سے نکل کر ان سے کہا آؤ۔ میں نے کہا، کہاں؟ اس شخص نے کہا خدا کی قسم! جہنم کی طرف۔ میں نے کہا، ان کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا یہ آپ ﷺ کے بعد اُلٹے پاؤں پیچھے پلٹ گئے۔ (۹۷/ج) یہاں صحیح بخاری کے نسخوں میں اختلاف ہے ایک نسخے میں **بینما انا نائم** ہے اور دوسرے نسخے میں **بینما انا قائم** یعنی ''جب میں (حوض کوثر پر) کھڑا ہوں گا'' کے کلمات ہیں۔ دوسری تمام متعلقہ روایات سے بھی دوسری روایت کے کلمات کی مکمل تصدیق وتوثیق ہوتی ہے۔ لہٰذا اس اختلافی جملے والی روایت سے استدلال کسی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ حوض کوثر کی اور بیسیوں احادیث موجود ہیں۔ اُنہیں کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ اگر **بینما انا نائم** والی روایت کو قبول کرنے پر ہی اصرار کیا جائے تو کسی بھی گروہ اور جماعت کے افراد کو نیند یا بیداری میں ایک مرتبہ دیکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس گروہ کے سب افراد کی فرداً فرداً صورتیں اور شکلیں، ان کے حلیے، لباس اور وضع قطع ہمیشہ کے لئے دیکھنے والے کے حافظے میں پوری طرح اور ٹھیک ٹھیک موجود رہے۔

د: حضرت ابوسعید الخدریؓ سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث مروی ہے کہ قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا تو میں اچانک موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ وہ عرش کا ایک پایہ تھامے ہوئے ہوں گے **فلا ادری افاق قبلی ام جوزی بصعقة الطور**

(۹۸/ الف) ''تو میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آچکے ہوں گے یا اُنہیں (کوہ) طور پر بے ہوشی کے معاوضے میں اس بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہوگا۔'' یہاں کلمات لاادری ''میں نہیں جانتا'' سے رسول اللہ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حالت کے متعلق اپنی بے خبری اور لاعلمی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی طرح کا مضمون مروی ہے۔ (۹۸/ ب) اسے رسول اللہ ﷺ کی تواضع اور انکساری کا نام دے کر حقیقت کو تسلیم کرنے سے راہ فرار اختیار کرنا کج فہمی اور کج روی ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) نہیں فرمایا کرتے کہ ایک بات کو جانتے بوجھتے ہوئے اس کے متعلق لاادری کہہ کر لاعلمی اور بے خبری کا غلط اظہار فرمائیں۔ فخر ومباہات سے اپنے آپ کو بچانے کا رسول اللہ ﷺ نے یوں اہتمام فرمایا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آپ کا ارشاد ہے لاتفضلوا بین انبیاء اللہ کہ اللہ کے نبیوں کے درمیان ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو یعنی اس طرح فضیلت نہ دو جس سے کسی بھی نبی کی توہین ہوتی ہو۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے قیامت کے دن کی مذکورہ بے ہوشی کا ذکر فرمایا۔ (۹۸/ ج) فخر ومباہات سے بعض اوقات آپ ﷺ نے اپنے آپ کو یوں بھی مبرا فرمایا ہے کہ آپ ﷺ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو ان کے انفرادی فضائل کی بنا پر افضل قرار دیا ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے والد، دادا اور پردادا بھی سب کے سب اللہ کے نبی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت کلی یعنی من حیث المجموع ہے۔ اس کا ایک ایک جزیئے کی حیثیت سے ہونا ضروری نہیں۔ آپ ﷺ نے زیر بحث حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انفرادی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ مزید برآں اپنے آپ کو فخر ومباہات سے بچانے کے لئے آپ ﷺ نے بسا اوقات اظہار حقیقت کے ساتھ ''ولافخر'' کے کلمات کا اضافہ فرمایا ہے کہ یہ حقیقت میں تحدیث نعمت کے طور پر بیان کر رہا ہوں، فخر ومباہات کا اظہار مقصود نہیں ہے۔ مثلاً بہ روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ کا دوست ہوں، فخر مقصود نہیں۔ میں بہ روز قیامت حمد کے جھنڈے کا اُٹھانے والا ہوں، فخر مقصود نہیں۔ میں اللہ کے نزدیک اگلوں اور پچھلوں میں سب سے زیادہ معزز ہوں، فخر مقصود نہیں۔ میں سب سے پہلے لوگوں کی سفارش کرنے والا ہوں، فخر مقصود نہیں۔ اور میں جنت کے حلقوں کو سب سے پہلے حرکت دوں گا، فخر مقصود نہیں۔ (۹۹/ الف) اور مثلاً بہ روایت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں بروز قیامت انبیاء علیہم السلام کا امام، ان کا خطیب اور صاحب شفاعت ہوں گا، فخر مقصود نہیں۔ (۹۹/ ب) لہٰذا یہ تاویل قطعاً غلط ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے آپ کو فخر ومباہات سے بچانے

کے لئے لاادری (معاذ اللہ) خلاف حقیقت کلمہ ارشاد فرمایا ہے۔

ھ: اس مضمون کی متعدد احادیث موجود ہیں کہ بروز قیامت سب سے پہلے رسول اکرم ﷺ بہ حالت سجدہ اللہ تعالیٰ سے لوگوں کے لئے سفارش کی اجازت طلب کریں گے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ثم یفتح اللہ علی من مجاھدہ وحسن الثناء علیہ شیئاً لم یفتحہ علیٰ احد قبلی (۹۹/ج) ''میری (اس حالت سجدہ میں) پھر اللہ مجھ پر اپنی عمدہ تعریف اور ثناء کے ایسے کلمات ظاہر فرمائے گا جو مجھ سے پہلے کبھی بھی کسی پر ظاہر نہیں کئے گئے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ اس وقت تک بھی عالم جمیع ما کان وما یکون نہیں ہوں گے۔ چناں چہ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک کی روایت میں ہے لاتحضرنی الان اور صحیح مسلم میں ہے لا اقدر علیہ الأن (۱۰۰/الف) یعنی حمد وثناء کے یہ کلمات اس وقت مجھے معلوم نہیں، میں ان کلمات پر اس وقت قادر نہیں ہوں۔ یہاں یہ تاویل مضحکہ خیز ہے کہ ممکن ہے دنیا میں ہی کسی وقت یہ کلمات آپ ﷺ کو سکھا دیئے گئے ہوں۔ جب رسول اللہ خود وضاحت فرما رہے ہیں کہ یہ کلمات مجھے بہ روز قیامت بہ حالت سجدہ سکھائے جائیں گے تو ایسی لغو تاویلات کا از خود قلع قمع ہو جاتا ہے۔ عالم آخرت کے متعلق ایسی کسی پیشین گوئی کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے بغیر ہو۔ پیغمبر کی پیشین گوئیاں یوں بدلنے لگیں اور وقت سے بے وقت ہونے لگیں تو سچے اور جھوٹے نبیوں میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عملاً یہ ظاہر فرمائے گا کہ مخلوقات میں سب سے اونچا درجہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کا ہے۔ اسی لئے آپ کو شفاعت کبریٰ کا منصب عطا فرمایا جائے گا۔ اور آپ ﷺ کو حمد وثناء کے کلمات عین اسی وقت سکھائے جائیں گے جو اس وقت سے پہلے کبھی بھی اور کسی پر بھی ظاہر نہیں کئے گئے۔ صرف آپ ﷺ پر ہی اس خاص موقع پر ظاہر کئے جائیں گے۔ یہاں کسی فاسد تاویل کی قطعاً کوئی گنجائش ہی نہیں۔ آپ ﷺ کو حمد وثناء کے یہ خاص کلمات عین اسی وقت آپ کی حالت سجدہ میں اسی لئے تو سکھائے جائیں گے کہ سب مخلوقات پر آپ ﷺ کی فضیلت و برتری اس خاص موقع پر عملاً خوب نمایاں ہو جائے کہ آپ ﷺ شفاعت کبریٰ کے عظیم ترین منصب کے حامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ (الف) النحل: ۶۴ (ب) البقرہ۔ ۲۵۵ (ج) آل عمران۔ ۴۴

۲۔ (الف) طٰہٰ: ۵۲ (ب) مریم۔ ۶۴ (ج) " " "

۳۔ (الف) بائیبل: کتاب پیدائش ۶: ۵۔ ۶ (ب) التوبہ۔ ۳۱ (ج) یوسف۔ ۳

۴۔(الف) ایضاً: ۱۰۲ (ب) آل عمران۔۴۴ (ج) القصص ۴۴۔۴۶

۵۔(الف) ایضاً: ۸۶ (ب) الشوریٰ۔۵۲ (ج) ھود۔۴۹

۶۔(الف) یٰس: ۳۱ (ب) البقرہ۔۴۹ (ج) الانعام۔۱۵۴

۷۔(الف) الاعراف: ۱۴۵ (ب) یوسف۔۱۱۱ (ج) النحل۔۸۹

۸۔(الف) الانعام: ۳۸ (ب) ازالۃ الریب عن عقیدۃ علم الغیب مؤلفہ مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ طبع اوّل محرم ۱۳۷۹ ہجری صفحہ ۴۸۱ بہ حوالہ اصول کافی ص ۱۴۰ (ج) ایضاً صفحہ ۲۱۵ بہ حوالہ اصول کافی مع الصافی کتاب الحجۃ جزء دوم حصہ اوّل ص ۲۲۹

۹۔(الف) الحشر: ۷ (ب) المؤمن۔۷۸ (ج) ابراہیم۔۹

۱۰۔(الف) طٰہٰ: ۱۵ (ب) النازعات: ۴۲۔۴۴ (ج) السجدہ۔۱۷

۱۱۔(الف) بنی اسرائیل: ۸۵ (ب) یٰس۔۶۹ (ج) النمل۔۲۳

۱۲۔(الف) الاحقاف: ۲۵ (ب) لقمان۔۲۷ (ج) العنکبوت۔۵۱

۱۳۔(الف) البقرۃ: ۱۶۴ (ب) السجدہ۔۱۱ (ج) الانبیاء۔۳۳

۱۴۔(الف) یٰس: ۴۰ (ب) الرحمٰن۔۵ (ج) الذاریات۔۴۷

۱۵۔(الف) النور: ۳۵ (ب) طٰہٰ: ۹۰۔۹۷ (ج) الانفال۔۶۰

۱۶۔(الف) یونس: ۵ (ب) حم السجدہ۔۵۳ (ج) الصافات ۱۰۶ (د) الاعراف۔۱۸۸

۱۷۔(الف) الملک: ۱۴ (ب) الانعام۔۶۲ (ج) الحج۔۷۸

۱۸۔(الف) مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۰۷ بہ حوالہ مسلم (ب) جمع الفوائد ۲/۲۸۸، حدیث رقم ۷۸۸۹ بہ حوالہ ابوداؤد (ج) ایضاً حدیث رقم ۷۸۹۰

۱۹۔(الف) یٰس: ۶۹ (ب) جمع الفوائد ج ۴ ص، حدیث رقم ۸۱۸۱ بہ حوالہ مسلم (ج) ایضاً ۳۲۱۲، حدیث رقم ۸۱۸۰ بہ حوالہ بخاری وابوداؤد وترمذی۔

۲۰۔(الف) ایضاً حدیث رقم ۸۱۷۶ بہ حوالہ بخاری وابوداؤد (ب) الشعراء: ۲۲۵۔۲۲۷ (ج) الحاقۃ۔۴۱

۲۱۔(الف) یونس: ۲ (ب) تفسیر ابن کثیر ج ۳ ۵۷۸، امجد اکیڈمی، اردو بازار، لاہور، طبع ۱۴۰۳ ہجری/۱۹۸۲ سیلادی (ج) ایضاً ۳/۵۷۹

۲۲۔(الف) صحیح مسلم ۲/۳۵۰ (ب) العنکبوت۔۴۸ (ج) الرعد۔۴۰

۲۳۔(الف) الغاشیۃ: ۲۱۔۲۲ (ب) ایضاً ۲۵۔۲۶ (ج) الانعام۔۱۰۷

۲۴۔(الف) ایضاً: ۵۲ (ب) الشوریٰ۔۲۲ (ج) ایضاً۔۶

۲۵۔(الف) الشعراء: ۱۱۲۔۱۱۳ (ب) الانعام۔۱۵۹ (ج) الملک۔۲۵

۲۶۔(الف) الاعراف: ۱۸۸ (ب) سبا۔۴ (ج) ایضاً ۵۔۶

۲۷۔(الف)الانعام:۶۰(ب)ھود۔۶(ج)فاطر۔۳

۲۸۔(الف)الزخرف:۳۲(ب)مجلہ السیرۃ عالمی شمارہ ۲۳، ربیع الاول ۱۴۳۱ ہجری/فروری ۲۰۱۰ عیسوی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز اے۔۴/۷ اناظم آباد نمبر ۴، کراچی صفحات ۱۹۷۔۱۹۹(ج)السجدہ۔۵

۲۹۔(الف)ابراہیم:۳۲۔۳۴(ب)الفتح۔۲۹(ج)مسلم ۲/۳۱۰ واللفظ لہ، مسند احمد ۳/۳۲۶، مستدرک للحاکم ۴/۴۹۹ وافقہ الذھبی

۳۰۔(الف)الاحزاب۔۳۹(ب)المائدہ۔۶۷(ج)جمع الفوائد ۲/۳۱۵، حدیث رقم ۸۱۱۲ بہ حوالہ ابوداؤد ترمذی (د) بخاری/۱۹۱، مسلم ۲/۲۹۱

۳۱۔(الف)الانعام۔۵۹(ب)جمع الفوائد ۲/۲۰۲، حدیث رقم ۷۱۵۰ بہ حوالہ بخاری (ج)لقمان۔۳۴

۳۲۔(الف)تفسیر ابن کثیر۔۳/۴۵۴ بہ حوالہ مسند احمد (ب) ایضاً ۳/۴۵۵ بہ حوالہ مسند احمد وقال ھذا اسناد صحیح (ج)الدر المنثور للسیوطی ۵/۱۷۰ بہ حوالہ ابن مردویہ

۳۳۔(الف)تفسیر ابن کثیر ۳/۴۵۴ (ب) ایضاً ۳/۴۵۵ (ج)الاعراف۔۱۸۷

۳۴۔(الف)تفسیر ابوالسعود ۴/۵۴۲، مدارک التنزیل للنسفی ۲/۶۸ (ب)تفسیر بیضاوی ۱/۲۶۷ (ج)الاحزاب۔۶۳

۳۵۔(الف)تفسیر ابوالسعود ۷/۳۵۲، بیضاوی ۲/۱۷۰، تفسیر خازن ۵/۲۲۸ (ب)الملک:۲۵۔۲۶ (ج)تفسیر ابوالسعود ۸/۳۰۷

۳۶۔(الف)یونس:۴۸۔۴۹(ب)تفسیر ابن کثیرؒ ۲/۴۲۰ (ج)بنی اسرائیل۔۵۱

۳۷۔(الف)رازیؒ/تفسیر کبیر ۵/۴۰۴ (ب)الانبیاء۔۱۰۹(ج)مدارک التنزیل للنسفی ۳/۷۱

۳۸۔(الف)النازعات:۴۲۔۴۴(ب)تفسیر ابوالسعود ۸/۴۰۰ (ج)تفسیر کبیر ۸/۳۵۴، خطیب شربینیؒ/السراج المنیر ۴/۴۸۴

۳۹۔(الف)المومن۔۷۸(ب)النساء۔۱۶۴(ج)مستدرک للحاکم ۱/۳۶، ۲/۴۵۰، وافقہ الذھبیؒ

۴۰۔(الف)طٰہٰ۔۱۵(ب)تفسیر ابن کثیر ۳/۱۴۴ (ج)الاعراف۔۱۸۷

۴۱۔(الف)تفسیر ابن جریر طبری ۹/۸۸، تفسیر خازن ۲/۵۶۵ (ب)النمل۔۶۵ (ج)الانعام۔۵۰

۴۲۔(الف)حم السجدہ۔۴۷(ب)الزخرف۔۸۵(ج)ھود۔۱۲۳

۴۳۔(الف)النحل۔۷۷(ب)الکہف۔۲۶(ج)الجن:۲۵۔۲۸

۴۴۔(الف)آل عمران۔۱۷۹(ب)التوبۃ۔۷۳، التحریم۔۹(ج)محمد:۲۹۔۳۰

۴۵۔(الف)التوبۃ۔۱۰۱(ب)شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ/اشعۃ اللمعات ۱/۴۵ (ج)ملا علی قاریؒ/مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۱/۶۶

۴۶۔(الف)بخاری ۱/۲، مسلم ۱/۲۹، نسائی ۲/۲۲۹، ابوداؤد ۲/۲۸۹، ابن ماجہ ص ۳۰۲ (ب)ابن حجر عسقلانیؒ/فتح الباری ۱/۱۵ بدرالدین عینیؒ/عمدۃ القاری ۱/۳۳۰ (ج)عقود الجواھر المنیفہ ناشر ایچ۔ایم سعید کمپنی کراچی، ص ۱۸۔۱۹

۴۷۔(الف) فتح الباری ۱/۶۲، عمدۃ القاری ۱/۲۹۶ (ب) فتح الباری ۱/۶۳، عمدۃ القاری ۱/۲۹۳ (ج) ابراہیم۔۹

۴۸۔(الف) تفسیر ابوالسعود ۶/۱۸۸، مدارک التنزیل ۲/۱۹۷، الدر المنثور ۴/۷۲، تفسیر کبیر ۵/۲۲۱، وغیرہ (ب) الدر المنثور ۴/۷۲، اخرجہ ابن جریر وعبد بن حمید وابن منذر وابن ابی حاتم (ج) تفسیر کشیر ۵/۲۲۱، معالم التنزیل للبغوی ۴/۲۲۸، وغیرہ

متعدد احادیث اور تفسیری روایات واقوال کے حوالے بوارق الغیب مصنفہ مولانا محمد منظور نعمانی مطبوعہ کتب خانہ مجیدیہ بیروں بوہڑ گیٹ ملتان، اور ازالۃ الریب عن عقیدۃ علم الغیب از مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ سے ماخوذ ہیں۔

۴۹۔(الف) المدثر۔۳۱ (ب) السجدہ۔۱۷ (ج) صحیح بخاری ۲/۷۰۴

۵۰۔ (الف) مختصر تفسیر ابن کثیر، اختصار و تحقیق محمد علی الصابونی، دار القرآن الکریم بیروت (لبنان)، ۳/۷۵۔۷۶ بہ حوالہ مسلم وترمذی (ب) ص: ۶۹۔۷۰ (ج) النساء۔۱۰۸

۵۱۔(الف) الحدید۔۴ (ب) المجادلۃ۔۷ (ج) التوبۃ۔۴۰

۵۲۔(الف) الرعد۔۴۰ (ب) سبا۔۱۳ (ج) جمع الفوائد ۲/۳۶۲، حدیث رقم ۸۴۳۹ بہ حوالہ شیخین

۵۳۔(الف) ایضاً ۲/۳۵۹۔۳۶۰، حدیث رقم ۸۴۳۶ بہ حوالہ شیخین وترمذی ونسائی (ب) المائدہ۔۱۰۹ (ج) تفسیر خازن ۲/۸۹

۵۴۔(الف) الانبیاء۔۱۰۳ (ب) النمل۔۸۹ (ج) الانعام۔۴۸

۵۵۔(الف) عبس۔۳۸ (ب) طٰہٰ۔۴۶ (ج) النحل۔۱۲۸

۵۶۔(الف) یونس۔۴۶ (ب) ق۔۱۶

۵۷۔(الف) المائدہ۔۱۱۷ (ب) الانعام۔۶۸ (ج) النساء۔۱۴۰

۵۸۔(الف) الانفال۔۳۳ (ب) سنن ابی داؤد ۲/۲۳۲ (ج) السیرۃ عالمی شمارہ ۲۲، ستمبر ۲۰۰۹ء ص ۱۹۷۔۱۹۸

۵۹۔(الف) آل عمران۔۱۰۱ (ب) الحجرات۔۷ (ج) التوبۃ۔۴۷

۶۰۔(الف) الاحزاب۔۶ (ب) التوبۃ۔۱۲۸ (ج) المائدہ۔۱۵

۶۱۔(الف) التکویر۔۲۴ (ب) النساء۔۱۱۳ (ج) البقرہ۔۱۵۱

۶۲۔(الف) الانعام۔۹۱ (ب) العلق۔۵ (ج) العادیات۔۶

۶۳۔(الف) المائدہ۔۱۷ (ب) صحیح مسلم ۲/۳۹۰ (ج) سنن ترمذی ۲/۳۶

۶۴۔(الف) الاعراف ۲۷ (ب) البقرۃ۔۳۳ (ج) سبا۔۱۴

۶۵۔(الف) جمع الفوائد ۱/۲۵۶، حدیث رقم ۲۵۵۷ بہ حوالہ نسائی (ب) ایضاً حدیث رقم ۲۵۵۶ بہ حوالہ شیخین و ابوداؤد (ج) صحیح مسلم ۲/۳۴۴

۶۶۔(الف) بخاری ۱/۴، مسلم ۲/۹۷ (ب) بخاری ۱/۳، مسلم ۱/۳۴ (ج) النجم۔۱۰

۶۷۔(الف) مسلم ۱/۹۴ (ب) بخاری ۱/۵۴۸، مسلم ۱/۹۶ (ج) بخاری ۲/۹۲۶، موطاء امام مالک ص ۳۱

۶۸۔ (الف) التوبۃ۔۱۱۹ (ب) جمع الفوائد ۲/۴۷۲، حدیث رقم ۷۷۲۹ بہ حوالہ ترمذی (ج) ایضاً حدیث رقم ۷۷۳۰ بہ حوالہ ابوداؤد

۶۹۔ (الف) الحجرات۔۱۲ (ب) انجیل متی ۱۸: ۲۰ (ج) مجلہ السیرۃ عالمی شمارہ ۱۶، رمضان المبارک ۱۴۲۷ ہجری/ ستمبر ۲۰۰۶ عیسوی صفحات ۲۱۳۔۲۲۸

۷۰۔ (الف) ایضاً شمارہ ۲۰، رمضان المبارک ۱۴۲۹ ہجری/ ستمبر ۲۰۰۸ عیسوی صفحات ۱۵۵۔۲۹۰ (ب) البقرۃ۔ ۳۴ (ج) بنی اسرائیل۔۹۵

۷۱۔ (الف) ابراہیم۔۱۱ (ب) بنی اسرائیل۔۹۳ (ج) الکہف۔۱۱۰

۷۲۔ (الف) ھود۔۴۶ (ب) آل عمران۔۵۴ (ج) النساء۔۱۴۲

۷۳۔ (الف) الاعراف۔۶۵ (ب) صحیح مسلم ۱/۱۲۶۔۱۲۷ (ج) بائبل: نیا عہد نامہ۔ فلپیوں ۲: ۶۔۸ (د) آل عمران۔۷۹

۷۴۔ (الف) الانعام۔۹۱ (ب) التغابن۔۶ (ج) ابراہیم۔۴

۷۵۔ (الف) الفرقان۔۲۰ (ب) الرعد۔۳۸ (ج) الملک۔۲

۷۶۔ (الف) الزمر۔۳۰ (ب) النحل۔۴۸ (ج) مستدرک للحاکم ۴/۴۵۶، مسند احمد ۶/۳۳۶

۷۷۔ (الف) جمع الفوائد ۱/۴۴۵، حدیث رقم ۴۳۴۳ بہ حوالہ المعجم الاوسط للطبرانی (ب) عبس: ۱۔۱۲، جمع الفوائد ۲/۲۲۷، حدیث رقم ۷۳۰۷ بہ حوالہ مالک وترمذی (ج) القیامۃ: ۱۶۔۱۷

۷۸۔ (الف) مستدرک للحاکم ۲/۳۸۴، وافقہ الذھبیؒ (ب) الدر المنثور للسیوطیؒ ۴/۱۵۲ بہ حوالہ سعید بن منصور واحمد وابن ابی شیبہ وابن ماجہ وابن جریر وابن المنذر وابن مردویہ والبیہقی فی البعث والنشور (ج) البقرۃ۔۱۴۴، جمع الفوائد ۲/۱۴۱، حدیث رقم ۶۷۸۴ بہ حوالہ شیخین وترمذی ونسائی

۷۹۔ (الف) آل عمران۔۶۷، جمع الفوائد ۲/۴۷، حدیث رقم ۶۴۸۲ بہ حوالہ ترمذی، وحدیث رقم ۶۴۸۳ بہ حوالہ احمد والمعجم الکبیر (ب) آل عمران۔۱۲۸، مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۳۱۷، جمع الفوائد ۲/۸۷، حدیث رقم ۶۵۴۴ بہ حوالہ شیخین وترمذی (ج) آل عمران: ۱۷۲۔۱۷۳، جمع الفوائد ۲/۸۷، حدیث رقم ۶۵۴۷ بہ حوالہ شیخین، وحدیث رقم ۶۵۴۸ بہ حوالہ المعجم الکبیر للطبرانی

۸۰۔ (الف) بخاری ۲/ ۵۶۸ (ب) جمع الفوائد ۲/۹۲، حدیث رقم ۶۵۶۹ بہ حوالہ شیخین (ج) ایضاً ۲/۲۰۳۔۲۰۴، احادیث رقم ۷۱۶۰۔۷۱۶۴ بہ حوالہ شیخین وترمذی ونسائی (د) ایضاً ۲/۱۹۱۔۱۹۵، احادیث ۷۱۰۲۔۷۱۰۴ بہ حوالہ شیخین وترمذی ونسائی۔

۸۱۔ (الف) ایضاً ۲/۲۱۹، احادیث ۷۲۷۴۔۷۲۷۵ بہ حوالہ شیخین وترمذی (ب) مستدرک للحاکم ۴/۳۸۵، جمع الفوائد ۲/۱۵۱، حدیث رقم ۶۹۱۰ بہ حوالہ ترمذی (ج) بخاری ۱/۴۸، ۲/۶۶۳، مسلم ۱/۶۰، ابوداؤد ۱/۴۵، موطاء امام مالکؒ صفحہ ۱۹

۸۲۔ (الف) بخاری ۲/۵۹۰، مسلم ۲/۹۵ (ب) الحاکم ۲/۱۲۳، وافقہ الذھبیؒ (ج) بخاری ۱/۳۷، مسلم ۲/۵۷۔۵۸

۸۳۔(الف) الفتح:۱۹۔۲۳، مختصر تفسیر ابن کثیر ۳/۳۴۲۔۳۴۳، ۳۴۵۔۳۴۶ (ب) بخاری ۱/۳۸۰ ملخصاً (ج) البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر تحقیق عبدالوہاب فتیح، دارالحدیث القاہرہ (مصر) الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۳ ہجری/۱۹۹۲ میلادی، ۵/۲۸۸ بہ حوالہ مسند احمد۔ مسلم ۲/۳۲۷، مستدرک للحاکم ۴/۳۹

۸۴۔(الف) بخاری ۱/۴۴۹، ۲/۶۱۰، ۸۶۰ (ب) مشکوٰۃ المصابیح ۲/۵۴۲ (ج) بخاری ۲/۶۳۷

۸۵۔(الف) مسلم ۲/۱۹۹ (ب) ایضاً (ج) جمع الفوائد ۱/۴۰۰، حدیث رقم ۳۹۳۲، بخاری ۲/۸۳۱

۸۶۔(الف) مسلم ۲/۱۵۱۔۱۵۲، ابوداؤد ۲/۱۷۶، ابن ماجہ ص ۲۴۱، نسائی ۲/۱۷۶، مسند احمد ۴/۳۲۰ (ب) ابوداؤد ۲/۱۷۶ (ج) بخاری ۱/۴۲۲، ۲/۶۱۲

۸۷۔(الف) جمع الفوائد ۲/۱۲۵، حدیث رقم ۶۶۷۴ بہ حوالہ بخاری و نسائی (ب) ایضاً ۲/۱۲۰، حدیث رقم ۶۶۶۲، بہ حوالہ بخاری وابوداؤد (ج) التوبۃ۔۴۳

۸۸۔(الف) التوبۃ۔۷۳ (ب) ایضاً۔۱۰۱ (ج) المائدہ۔۵۲

۸۹۔(الف) التوبۃ:۱۰۷۔۱۰۸ (ب) جمع الفوائد ۲/۱۷۴، حدیث رقم ۷۰۰۰ بہ حوالہ شیخین ونسائی (ج) التوبۃ۔۸۴

۹۰۔(الف) بخاری کتاب المناسک، مسلم ۱/۳۹۲، ۳۹۶ (ب) جمع الفوائد ۱/۳۴۹، حدیث رقم ۳۴۴۴ بہ حوالہ ترمذی وابوداؤد (ج) ترمذی عن جابرؓ ۱/۱۷۸

۹۱۔(الف) کنز العمال ۵/۴۸ بہ حوالہ مسند احمد (ب) بخاری ۱/۹۹، مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۰۲ بہ حوالہ شیخین (ج) سنن ابی داؤد ۲/۲۹۳، باب فی استخلاف ابی بکر

۹۲۔(الف) طحاوی ۱/۲۳۶ (ب) بخاری ۱/۳۲۸ (ج) مستدرک للحاکم ۲/۱۴، واقفہ الذہبیؒ

۹۳۔(الف) جمع الفوائد ۱/۱۳۲، حدیث رقم ۱۲۸۱ بہ حوالہ ابوداؤد (ب) طٰہٰ۔۱۲ (ج) جمع الفوائد ۲/۲۲۱، حدیث رقم ۲۸۳۷ بہ حوالہ شیخین وابوداؤد والنسائی

۹۴۔(الف) التحریم:۱۔۲ (ب) ایضاً۔۳ (ج) جمع الفوائد ۱/۲۴۶، حدیث رقم ۲۴۴۸ بہ حوالہ بزار

۹۵۔(الف) ایضاً ۲/۲۸۹، حدیث رقم ۱۰۰۲۴ (ب) بخاری ۲/۹۶۵، ۹۷۴، مسلم ۱/۱۲۶، ۲/۲۴۹۔۲۵۰، ۲۵۲، ۳۸۴، ترمذی ۲/۶۵، مسند احمد ۱/۲۳۵، ۳۸۴، ابن ماجہ ص ۳۲۹، وغیرہ (ج) مسلم ۲/۲۴۹، بخاری ۲/۹۷۵۔

۹۶۔(الف) بخاری ۲/۹۶۶، مسلم ۲/۳۸۴ (ب) بخاری ۱/۲۰۲، مسلم ۱/۲۴۳ (ج) نووی شرح مسلم۔۱/۲۴۴

۹۷۔(الف) مسلم ۱/۱۲۷ (ب) نووی شرح مسلم (حاشیہ) ۲/۲۴۹ (ج) بخاری ۲/۹۷۵

۹۸۔(الف) بخاری ۱/۴۸۱ (ب) بخاری ۱/۳۲۵، مسلم ۲/۲۶۷ (ج) ایضاً

۹۹۔(الف) جمع الفوائد ۲/۳۴۳، حدیث رقم ۸۳۵۲ بہ حوالہ ترمذی (ب) ایضاً حدیث رقم ۸۳۵۳ بہ حوالہ ترمذی (ج) بخاری ۲/۶۸۵، مسلم ۱/۱۱۱، ترمذی ۲/۶۶

۱۰۰۔(الف) بخاری ۲/۱۱۱۸، مسلم ۱/۱۱۰